ڈاکٹر جمال نقوی کی ادبی خدمات

(ترقی پسند تحریک کے تناظر میں)

مقالہ نگار

صائمہ یعقوب

ڈاکٹر جمال نقوی کی ادبی خدمات

(ترقی پسند تحریک کے تناظر میں)

مقالہ نگار

صائمہ یعقوب

ضابطہ

کتاب کا نام	:	ڈاکٹر جمال نقوی کی ادبی خدمات
مقالہ نگار	:	صائمہ یعقوب
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
تعداد	:	۵۰۰
کمپوزنگ / سرورق	:	ثاقب جاوید۔ بساطِ ادب (پاکستان)
مطبع	:	
قیمت	:	۲۰۰ روپے
ناشر	:	ادارہ ترئین دانش
پتہ	:	سی۔۱۰۸، بلاک۔ جے نارتھ ناظم آباد، کراچی
فون نمبر	:	021-36631095

فہرست ابواب

مسلم شمیم
مرکزی صدر، انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان

حرفِ سپاس و اعتراف

ڈاکٹر جمال نقوی ترقی پسند قلم قبیلہ کے رکن رکین ہیں اور آج ملک کے تمام تر ترقی پسند حلقوں میں صرف جانے پہچانے نہیں جاتے بلکہ ایک کمیٹڈ آدرش وادی کی حیثیت سے عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کی ادبی کارگزاریاں اور تخلیقی و تحقیقی کارنامے اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔ وہ کثیر الجہات قلم کار ہیں۔ نثر و نظم ہر دو شعبوں میں ایسے نقوش صفحۂ قرطاس پہ چھوڑے ہیں جن کی تابندگی اور تابانی قارئین کے لیے بصیرت و بصارت کے سامان فراوانی سے پیدا کرتی ہے۔ انہوں نے اب تک ۳۶ کتب اپنے ادبی میزانیہ میں شامل کر کے بہتوں کے لیے challenge کا مرحلہ پیدا کر دیا ہے۔ مذکورہ ادبی میزانیہ کی کثیر الجہتی اور جامعیت لائق توجہ و توصیف ہے۔ ''گلہائے عقیدت'' منقبت کا مجموعہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں سال بہ سال ان کی تصنیفات منظر عام پر آتی رہیں جن میں تخلیقی یعنی شعری مجموعے بھی شامل ہیں اور تنقید و تحقیق کی کتابیں بھی۔ غیر ادبی موضوع پر ان کی کتابیں انجینئرنگ ہورائزن اور ''قائد ین پاکستان'' بھی اپنے مواد کے اعتبار سے وقیع اور معنویت کی حامل ٹھہرتی ہے۔ ''ادب اور سائنس'' اور ''ادب، سائنس اور جمہوریت'' ان کی اہم فکری اور نظریاتی کاوش کا نتیجہ کہلانے کا استحقاق رکھنے والی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ قارئین کو عہد جدید اور ہمعصر ادبی موضوعات کا ادراک بخشتا ہے۔ ادب کے سماجی رویے اور کردار کی ان کتب میں تفسیر و تفہیم پر توجہ مرکوز کی گئی اور موضوعات

کے ساتھ بھرپور انصاف کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں ڈاکٹر جمال نقوی کے وسیع مطالعہ کے ساتھ ان کی علمی اور فکری بصیرت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کے دائرۂ مطالعہ کا پھیلاؤ بہت وسیع ہے۔ وہ ایک انجینئر کی حیثیت سے خالص سائنسی علوم کا قابل رشک ادراک و شعور رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی سماجی علوم یعنی social sciences کے سفرارتقا سے وہ باخبر صاحب قلم ہیں۔ وہ اس تناظر میں سائنس اور ادب کے باہمی رشتوں، کا ان کا بیان قارئین کے لیے رہنمائی اور ذہنوں کو جلا بخشنے کی اہلیت کا حامل قرار پائے گا۔

ڈاکٹر جمال نقوی کے سفرادب وشعور میں دو تہذیبی، علمی اور ثقافتی مراکز لکھنؤ اور علی گڑھ کا بڑا حصہ اور کردار ہے۔ وہ لکھنؤ میں 1946 میں پیدا ہوئے یعنی لکھنؤ کی تہذیبی، ثقافتی اور ادبی فضاؤں میں آنکھ کھولی بہ الفاظ دیگر ان کے حصے میں ایک قابل رشک تہذیبی ورثہ آیا اور ان کے رگ و پے میں یہ ورثہ اپنے پائیدار اثرات کا جادو جگاتا رہا اور ان کی بصیرت و بصارت کے ساتھ ان کے ادب و شعر کی دنیا کو منور کرتا رہا۔ ان کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے شہرۂ آفاق آصف الدولہ کے امام باڑے میں قائم شدہ شیعہ اسکول میں ہوئی یعنی ان کے حصول علم کا آغاز مذہبی ماحول اور مذہبی نصاب سے عبارت ہے۔ مذہب سے ان کی گہری وابستگی آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی مذہب سے وابستگی ان کی نہ تو روشن خیالی سے متصادم ہے اور نہ خرد افروزی کی تابناکی سے۔ ان کی ترقی پسندیدیت کو ہم مولانا حسرت موہانی کی ترقی پسند نظریہ سے مثالی وابستگی کے تناظر میں دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ مولانا ترقی پسند تحریک کے سرخیلوں میں سے تو تھے ہی وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے تھے اور ۱۹۲۵ء میں کانپور میں منعقدہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگریس کی تنظیمی کمیٹی کے چیئرمین اور مولانا آزاد سبحانی نائب چیئرمین تھے۔ ڈاکٹر جمال نقوی کی ترقی پسند نظریہ اور تحریک سے گہری اور فعال وابستگی آفتاب آمد دلیل آفتاب کی مانند ہے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کے شعبہ میں ڈگری حاصل کی اور

ایک نہایت کامیاب اور صاحب اوراک انجینئر کی حیثیت سے مختلف اداروں میں اپنے فرائض منصبی انجام دیے اور ایک عرصہ تک کراچی شپ یارڈ جیسے معتبر و معروف قومی ادارے سے وابستہ تھے۔ اور بہ حیثیت جنرل منیجر ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن کا ڈپلومہ برطانیہ سے حاصل کیا۔ اردو ادب و شعر جوان کے خمیر کا جزو لاینفک تھے سوانہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی اور کراچی یونیورسٹی سے ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال، کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

میرے نزدیک تخلیق کار کی شخصیت سے آگاہی اور کم از کم اجمالی واقفیت اس کی تخلیقات اور اس کی تخلیقی زندگی کی تفہیم کے لیے ناگزیر ضرورت ٹھہرتی ہے کیونکہ تخلیق، تخلیق کار کی شخصیت کا عکس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جمال نقوی کی شخصیت جامعیت اور کثیر الجہتی کی تعمیر میں ان کی انتھک محنت جوان کی فطرت ثانیہ کہی جانی چاہیے کا بڑا حصہ ہے۔ وہ جہد حیات میں اپنی کارگزاریوں اور کامرانیوں کی روشنی میں ایک قابل تقلید مثالیہ کہے جاسکتے ہیں۔ ان کا درج ذیل شعر ان کے سفر جہد حیات کا ترجمان ہے:

آخری عمر تک ساتھ نہ چھوڑوں گا ترا
زندگی تجھ سے یہ وعدہ مرا مرنے تک ہے

یہ تحریر ڈاکٹر جمال نقوی پر لکھے گئے مقالہ "ڈاکٹر جمال نقوی (ترقی پسند تحریک کے تناظر میں) کے حوالے سے ہے۔ یہ مقالہ ایم اے اردو کے حصول سند کے لیے جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد کے شعبہ اردو میں جمع کرایا گیا اور مقالہ نگار ہیں محترمہ صائمہ یعقوب۔ مقالہ نگار نے جس دقت نظر اور بالغ نظری کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ مقالہ لکھا، حصول سند میں میں انہیں سرخروئی حاصل ہوئی۔ یہ بات بڑی اہمیت اور معنویت کی حامل ہے کہ ڈاکٹر جمال نقوی کے ادبی کارناموں کا واقعی استحقاق بنتا ہے کہ ان پر اس قسم کا تحقیقی مقالہ لکھا جاتا سو یہ مقالہ ان کی ادبی شخصیت اور ان کے علمی اور فکری جہتوں کا حاصل مطالعہ کمال ہنر

کے ساتھ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمال نقوی کے ادبی سفر کے اس مرحلہ میں یہ مقالہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ٹھہرتا ہے اور اسے ایک وقیع اعتراف نامہ کہا جا سکتا ہے۔ جہاں مقالہ نگار تہنیت و تبریک کی مستحق ٹھہرتی ہیں وہاں ڈاکٹر جمال نقوی بھی تہنیت و تبریک کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ ان کی کثیر الجہت ادبی شخصیت اور خدمات کا احاطہ کرتا ہے مگر خصوصی توجہ ان کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی پر مرکوز رکھی گئی ہے۔

ڈاکٹر جمال نقوی کے ترقی پسند نظریات کا سرسری طور پر مطالعہ کیا جائے تو مثبت نتیجہ اخذ کرنے میں قارئین کو کوئی الجھن اور ابہام سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ وہ ایک ایسے ترقی پسند دانشور اور قلم کار ہیں جن پر dogmatic ہونے کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند تخلیقات کو بہت وسیع تر تناظر میں دیکھنے کے قائل ہیں۔ وہ یہ واضح طور پر سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند نظریہ کوئی عقیدہ نہیں اور نہ ترقی پسند قبیلہ کا رکن بننے کے لیے کوئی کلمہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ترقی پسند تحریک وہ تاریخ کی پیداوار ہے اور اسے سماجی ارتقا کے سائنسی نظریے کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر جمال نقوی ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بخوبی واقف ہیں کہ ترقی پسندیت اور ترقی پسند تحریک کی کہانی سماجی ارتقا کا جزو لاینفک ہے۔ سماجی زندگی کے آغاز سفر سے اس کہانی کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ انسان جنگل اور غاروں سے نکل کر جب کھیتی باڑی کے دور میں آیا اور ایک عرصۂ دراز تک کلی طور پر اجتماعی سماجی زندگی یعنی ابتدائی اشتراکیت (Primtive Commiunism) کے عہد میں رہا اور یہ عرصہ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اس سماجی عمل میں جب نجی ملکیت نے جنم لیا تو غیر طبقاتی سماج، طبقاتی سماج میں بدل گیا اور یہیں سے طبقاتی کشمکش اور آویزش کا سلسلہ شروع ہوا۔ طبقاتی کشمکش اور معرکہ آرائی کی تاریخ دراصل سماج میں ترقی پسند قوتوں اور رجعت پسند قوتوں کے درمیان کشمکش اور جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس کو معرکۂ خیر و شر بھی سمجھنا چاہیے۔ اس معرکۂ خیر و شر سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سماج سفر ارتقا پر گامزن ہے۔ سماجی ارتقا تغیر و

ترقی اور انقلابات کے مراحل سے دوچار ہوتا ہوا قانون فطرت کی عمل داری میں سرخ روئی کی منزلوں سے ہم کنار ہوتا آیا ہے۔ انسان اور انسانی تمدن وتہذیب کا سفر ہمیشہ سے پیش رفت کا سفر رہا ہے۔ سکوت وجمود کے کچھ ادوار مثلاً یورپ میں ہزار سالہ عہد تاریک ضرور تاریخ کا حصہ بنے ہیں مگر ان ادوار کو زوال آدم کے نظریے یا رجعت پرستی کے حق میں پیش کرنا تاریخی شعور سے بے اعتنائی برتنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر جمال نقوی کی اس ضمن میں کتابیں اور تحریریں ان کے وسیع تر نظریاتی مطالعے کی مظہر ہیں۔ ان کے ہاں یہ تاریخی حقیقت غیر مبہم پیرایہ اظہار میں بیان کی گئی ہے کہ ترقی پسند تحریک کسی اتفاقی واقعے اور حادثے کی پیداوار نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ کے جدلیاتی عمل کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آئی۔ یہ تحریک اپنے ابتدائے سفر سے آفاقیت اور بین الاقوامیت کی حامل رہی ہے۔ اس ورثے میں سیکولرازم (ہمہ دینیت) روشن خیالی، تعقل پسندی اور خرد افروزی کی اعلیٰ اور صحت مند اقدار وروایات ملیں۔ جنہوں نے نئے خیالات وافکار سے لیس ہو کر فرسودہ اخلاقیات کہنہ رسم ورواج، استحصالی سیاست، معیشت وثقافت، طرز حیات کو بدلنے کے لیے جدوجہد کی، آزادی، سماجی، عدل اور مساوات کا نعرہ بلند کیا۔ توہم پرستی کی نفی کی، سائنسی افکار وعلوم اور تصورات کو فروغ دیا۔ اٹھارویں صدی کی روشن خیالی کی تحریک نئے خیالات اور افکار کے لیے نقطہ آغاز کا درجہ رکھتی ہے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب نے سوچ اور فکر کی نئی سمتیں اور جہتیں تلاش کرنے کی داغ بیل ڈالی۔ مذکورہ ورثے کا بھرپور ادراک ہمیں ڈاکٹر جمال نقوی کی ترقی پسندی کے شعوری سفر میں نظر آتا ہے۔ برصغیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک اس ادبی تحریک کی ترقی یافتہ شکل یا توسیع ہے جس کی ابتدا برطانوی نوآبادیات کے غلبے کے بعد ہوئی۔ اردو میں اس نئی تحریک کی طرح سرسید اور ان کے ساتھیوں نے ڈالی تھی۔ غالب جو کلاسیکی دور کا آخری اور عہد جدید کا پہلا مفکر شاعر تھا، وہ ترقی پسند تحریک کا پیش رو تھا۔ غالب نے سرسید کی ذہنی رہنمائی آئین اکبری کے لیے لکھے گئے منظوم پیش لفظ میں کی اور

سرسید نے نئی فکری تبدیلیوں کو غالب کی سطح سے آگے جا کر دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان تبدیلیوں کو اپنائے بغیر اور جدید سائنسی علوم کو سیکھے بغیر ہندوستان کے مسلمان ترقی کی دوڑ میں نہ صرف پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ممکن ہے اپنا تشخص بھی برقرار نہ رکھ سکیں۔ لہٰذا انہوں نے تہذیبی فکر کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے پر زور دینا شروع کیا اور اس مقصد کے لیے سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔

ڈاکٹر جمال نقوی کے ادبی کارناموں کی کتب میں سب سے نمایاں حصہ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند آدرش پر مشتمل ہے۔ ان کی ۳۶ تصنیفات اور تالیفات میں درج ذیل کتب نظریاتی موضوعات کے خانے کی ہیں اور ان کے نظریاتی موضوعات کا ماخذ و منبع ترقی پسند فکر و شعور اور ترقی پسند ادب اور تحریک ہے۔ (۱) ادب اور سائنس (۲) ادب سائنس اور جمہوریت (۳) ترقی پسند تحریک۔ ادب اور سجاد ظہیر (۴) مجنوں گورکھپوری شخصیت اور فن (۵) ترقی پسند تحریک کا سفر (۶) فیض کا فکری ابلاغ (۷) ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔ شخصیت اور فن (۸) ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال (۹) ترقی پسند ادب کے معمار۔

یہی وجہ ہے کہ مقالہ نگار محترمہ صائمہ یعقوب نے ان کی ادبی زندگی، سفر اور حاصلات کو ترقی پسند تحریک کے تناظر میں پیش کیا ہے اور اپنے موضوع کے ساتھ انہوں نے بھرپور انصاف کیا ہے۔

زیر نظر مقالہ کا باب دوم 'جمال نقوی کا شعری سفر' ہے۔ اس باب میں ان کی تخلیقیت کی جہتیں غزل اور دیگر اصناف سخن کے حوالے سے بڑی چابکدستی اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ ان کی شعری سفر کا آغاز حسب روایت غزل سے ہوا ہے اور ایک طرحی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

روش روش پہ فضا خوشگوار ہے ساقی
چمن میں آج مکمل بہار ہے ساقی

نگاہ در پہ تصور میں جام و پیمانہ
کچھ اس طرح سے ترا انتظار ہے ساقی

یہ غزل کلاسیکی روایت کی خوبصورت نمائندگی کرتی ہے جس سے ڈاکٹر جمال نقوی کے شعری مزاج اور ان کے خمیر میں شعریت کس درجہ رچی بسی ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں ہندی کا ایک مقولہ برمحل اور معنویت کا حامل ہے۔ یعنی ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

ڈاکٹر جمال نقوی کے جہانِ فکر و دانش کی تابانی اور تابندگی کا سرچشمہ جہاں ترقی پسندیت ہے وہاں شعر ادب کے مزاج اور افتادِ طبع جزولاینفک ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے جذبہ واحساس کے ساتھ سماجی شعور کا عمل دخل بھی نمایاں ہے۔ ان کی غزل کو پڑھتے وقت غزل کے سفر ارتقا کے مراحل اور نشیب و فراز سے بھی قارئین کو آگاہی ہوتی ہے۔ ان کی غزل میں کلاسیکی روایت کی پاسداری بھی پائی جاتی ہے۔ اور جدید حسیت اور جدید فکر کی کارفرمائی بھی۔ ان کی نظموں میں بھی موضوعات کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ جاپانی صنفِ سخن ہائیکو سے ان کی غیر معمولی دلچسپی اور اس کے لوازمات اور تقاضوں کے برتنے میں انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ہمعصر زندگی کے مشاہدات کی جلوہ سامانیاں "نغمے سورج دیس کے" جو ان کے ہائیکو کا مجموعہ ہے، میں قارئین کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتیں۔

ڈاکٹر جمال نقوی کی کثیر الجہت ادبی شخصیت کا زیرِ نظر مقالہ میں مقالہ نگار نے پوری ادبی دیانت داری اور خلوص کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر جمال نقوی کے کمٹ منٹ ظہار و بیان جو زندگی اور سماج کے ساتھ ان کا عہد و پیمان وفا کی طرح ہے، بہت متاثر کن ہے۔ اس مقالہ میں ان کے ادبی منصب کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ اور ان کی ادبی خدمات اور کارناموں کا فراخ دلانہ مگر دیانت دارانہ اعتراف کیا گیا ہے۔

صائمہ یعقوب

پیش لفظ

ڈاکٹر جمال نقوی ایک ترقی پسند دانشور ہیں، جن کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے وہ شاعر ہیں، نثر نگار ہیں، نقاد ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی حیثیت ترقی پسند تحریک کے جدید منظر نامے پر ایک معمار کی بھی ہے، جنھوں نے اِس تحریک کے نظریے کے پرچار کے لیے کئی ایک وسائل اِستعمال کیے۔ وہ کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں لیکن میرے مقالے کی تحریر ترقی پسند تحریک کے تناظر میں اُن کی خدمات تک کی گئی ہے۔

ایم اے (اردو) کی سند کے حصول کے لیے جولائی ۲۰۱۳ء میں مکمل کردہ زیرِ نظر مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے:

باب اوّل میں "ڈاکٹر جمال نقوی ــــ سوانح و شخصیت" کے عنوان سے جمال نقوی کے احوالِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔

باب دوم میں جمال نقوی کا شعری سفر بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں ان کی شاعری میں ترقی پسند نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم میں ترقی پسند تحریک کا تشکیلی پس منظر بیان کیا گیا ہے اور ڈاکٹر جمال نقوی کی نثر میں ترقی پسند نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم میں "ترقی پسند تحریک اور اہلِ دانش" کے عنوان سے ہے اس باب میں تحریک سے وابستہ مختلف دانشوروں کے خیالات کو بیان کیا گیا ہے اور ان کی تحریروں میں ترقی پسند سوچ کی وضاحت کی گئی ہے۔

آخر میں ماحصل، مصادر و مراجع کے ساتھ ہی ڈاکٹر جمال نقوی کے اعزازات اور تصنیفات و تالیفات وغیرہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

اس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بہت سے لوگوں نے میرا ساتھ دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے کام مکمل کرنے کا حوصلہ دیا۔ میں یہاں اپنے اہلِ خانہ کا ذکر ضروری خیال کرتی ہوں۔ تحقیق ایک کٹھن کام ہے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میرے بھائیوں کا مکمل تعاون میرے ساتھ رہا۔ میں اپنے والدین کی احسان مند ہوں، جنھوں نے تسوید و تکمیل مقالہ کے جملہ مراحل میں میری سرپرستی فرمائی اور ان کی دعائیں ہر لمحہ میرے ساتھ رہیں۔ میں خاص طور پر اپنے دادا جان کی شکر گزار ہوں، جنھوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں داخلے کی خواہش کو پورا کیا۔ اس کے بعد میں اپنے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی کی ممنون ہوں جن کی مخلصانہ راہنمائی اور شفقت کی بدولت یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ علاوہ ازیں میں شعبۂ اُردو کے صدر محترم ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس اور تمام اساتذہ کرام کی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور علمی معاونت کی۔

میں اپنے شعبہ کے سابق صدر عزت مآب جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے شعبے میں تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دیا اور اُن کی بدولت ہی میری رسائی ڈاکٹر جمال نقوی تک ممکن ہوئی۔ میں محترم جمال نقوی کی بھی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے اِس سلسلے میں میری معاونت کی اور مجھے تحریری مواد فراہم کیا۔ میں اپنی ہم جماعت کا شکریہ ادا کرتی ہوں، جنھوں نے اِس تحقیقی سفر میں میرا ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ اِس سلسلے میں خصوصاً رابعہ راناؔ، سائرہ افضل، اقراء ندیم، سدرہ رشید، شاہدہ تاج اور اپنی ہاسٹل فیلوز حفصہ ریاض، نوشین انور اور بشریٰ انور کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔

میرے لیے یہ تحقیقی مقالہ لکھنا ایک خوشگوار علمی تجربہ ثابت ہوا ہے۔ میں نے موضوع سے انصاف کرنے کی مقدور بھر کوشش کی، لیکن مقالہ تسامحات اور لغزشوں سے مبرا نہیں، مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے۔

میں محترم مسلم شمیم، مرکزی صدر، انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی ممنون ہوں کہ انہوں نے 'دیباچہ' کے طور پر 'حرفِ سپاس و اعتراف' تحریر کیا۔ آخر میں مقالہ کی اشاعت کے سلسلے میں 'ادارہ تزئینِ دانش' کا شکریہ ادا کرنا بھی میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

باب اوّل

ڈاکٹر جمال نقوی ___ سوانح و شخصیت

ڈاکٹر جمال نقوی اُردو ادب کی اُن شخصیات میں شمار ہوتے ہیں، جن کی کئی ایک حیثیتیں ہیں۔ وہ ایک شاعر ہیں، نقاد ہیں اور ایک دانشور بھی۔ ایک اہلِ قلم ہونے کے ناتے انھوں نے اپنی تحریروں میں بہت سے دانشورانہ مباحث کو حصہ بنایا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند ادیب ہیں اور انھوں نے اپنی تصانیف میں اس تحریک کو کئی ایک زاویوں سے دیکھا ہے۔ اس سے قبل کہ اُن کے علمی ادبی سرمائے کا جائزہ لیا جائے۔ اُن کے بعض شخصی کوائف ملاحظہ کرنا ضروری ہے۔

ا۔ خاندانی پس منظر

علم و ادب کے گہوارے یعنی لکھنؤ کے ایک صاحبِ علم اور صاحبِ حیثیت خاندان میں جمال نقوی نے آنکھ کھولی۔ ان کے والد سیّد غلام حسنین نقوی کا شمار لکھنؤ کے صاحبانِ علم و ادب میں ہوتا تھا۔ ان کا آبائی وطن فتح پور ہنوہ ہے لیکن اپنے زمانۂ طالب علمی میں جب وہ لکھنؤ آئے تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے والد اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ اس لیے انھوں نے ساری عمر جدوجہد کی اور اپنی قسمت اپنے ہاتھوں سے بنائی۔

ڈاکٹر ظہیر فتح پوری اپنی تحقیقی کتاب ''رُسوا کی ناول نگاری'' میں مرزا محمد ہادی رسوا کے احباب میں غلام حسنین نقوی کا ذکر بھی کیا ہے:

> "ویمنس کالج کی ملازمت چھوڑنے کے بعد ۱۸۹۹ء کے اوائل میں وہ (مرزا رُسوا) گھسیاری منڈی والے مکان سے گولا گنج کے ایک مکان میں آگئے جو کرسچین کالج کے سامنے لب سڑک تھا۔ حیدرآباد دکن جانے تک ان کا قیام اسی مکان میں رہا۔ جناب خادم عباس، رئیس میراں پور کا بیان ہے کہ اس دو منزلہ مکان کا نچلا حصہ مردانہ تھا اور اوپر والا حصہ زنانہ تھا کچھ عرصے کے بعد مرزا نے الحکم کا دفتر کھولا اور ایک کمرہ حاجی غلام حسنین نقوی کو قیام کے لیے دے دیا جو حصول علم کے لیے فتح پور ہنوہ سے لکھنؤ آئے اور رسالے کی ترسیل اور خط و کتابت کا کام کرتے تھے اور اس کام کے بدلے ان کے قیام وطعام کی ذمہ داری مرزا نے اپنے ذمے لے لی تھی۔"(۱)

اس کے علاوہ تقسیر فتح پوری کی اس کتاب سے ہی پتہ چلتا ہے کہ غلام حسنین نقوی اس زمانے میں مضامین بھی لکھنے لگے تھے۔ بعد میں ان کا کچھ مضامین رسالہ سرفراز اور دیگر مجلّوں میں شائع ہوئے جن سے ان کے ادبی ذوق وشوق کا پتہ چلتا ہے۔ غلام حسنین نقوی کے احباب کی فہرست میں مشہور زمانہ ادبی شخصیات حضرت جوش ملیح آبادی، علی عباس حسینی، خواجہ اطہر حسین، عزیز لکھنوی، ممتاز حسین جونپوری، احتشام حسین، علامہ اختر علی تلہری، مسعود حسن رضوی ادیب اور خاندان انیس و دبیر کے شعراء شدید لکھنوی اور نجیر لکھنوی کا نام آتا ہے۔

جمال نقوی کے والد نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی سے ان کی ایک بیٹی ہے جن کی شادی ابراہاں سادات ضلع فتح پور ہنوہ میں ہوئی، جن کے خاندان کے چند نفوس کے علاوہ باقی سب مڈل ایسٹ اور امریکہ جا چکے ہیں۔ غلام حسنین نقوی کی دوسری بیوی احمدی بانو کے بطن سے سید علی حسنین نقوی، سید محمد حسنین نقوی اور غلام السطین نقوی ہیں۔

ii۔ ولادت اور اصل نام

جمال نقوی نے ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں آنکھ کھولی۔ آپ کا اصل نام سید علی حسنین نقوی ہے اور تخلص کے طور پر جمال نقوی لکھتے ہیں۔

iii۔ تعلیم

جمال نقوی نے قرآن پاک اور ابتدائی دینی تعلیم گھر پر اپنی والدہ سے حاصل کی۔ وہ کوئی پڑھی لکھی خاتون نہیں تھیں۔ اس لیے ان کے دل میں اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوانے کا شوق تھا۔

ابتدائی تعلیم آصف الدولہ کے امام باڑے کی غلام گردشوں میں قائم شیعہ اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد آپ شیعہ کالج ڈالی گنج میں چلے گئے اور انٹر کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ساٹھ کی دہائی میں ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی تعلیم زوروں پر تھی۔ تمام والدین یہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے ڈاکٹر یا انجینئر بنیں۔ ان کے والد کو وکالت اور سماجی و ادبی کاموں سے نہ تو فرصت ملتی تھی اور نہ ہی انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے خود ساری زندگی محنت کی تھی اور چاہتے تھے کہ ان کی اولاد بھی جد و جہد کرے۔ وہ صرف امتحان کا نتیجہ پوچھتے تھے اور اپنا فیصلہ سنا دیتے تھے، جب جمال نقوی نے انٹر کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تو ان کے والد گرامی نے کہا کہ اب آگے مزید تعلیم حاصل کرنے کی بجائے کلرکی کی نوکری کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ مگر ان کی والدہ کی شدید خواہش تھی کہ ان کے بچے مزید تعلیم حاصل کریں۔ ان کے محلے کا ایک لڑکا علی گڑھ سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر ان کی والدہ کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی تو وہ بھی علی گڑھ سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ انھوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن کا ڈپلومہ برطانیہ سے حاصل کیا۔ اُردو ادب سے خصوصی لگاؤ کے باعث انھوں نے کراچی

یونیورسٹی سے ایم۔اے اُردو کیا اور 'ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

iv۔روزگار

اپنی ملازمت کا باقاعدہ آغاز انھوں نے پاکستان سے ہی کیا۔ ۱۹۶۹ء میں علی گڑھ انجینئرنگ کا امتحان پاس کر کے میر پور خاص آ گئے اور چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد حبیب انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، نواب شاہ سے تقرر نامہ مل گیا۔ ان کے روزگار کے سلسلے میں اُتار چڑھاؤ آئے انھوں نے مختلف ادوار میں مختلف اداروں میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔ ایک عرصہ انھوں نے العطا ٹیکسٹائل مل کے Maintenance Dept میں نوکری کی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک امریکن کمپنی جنرل ٹائر میں نوکری کی۔ بعد ازاں انھوں نے نیشنل کنسٹرکشن کمپنی میں خدمات سرانجام دیں۔ اس کے بعد انھوں نے کراچی شپ یارڈ میں بطور منیجر ملازمت کے فرائض سرانجام دیے۔ یوں انھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں جنرل منیجر کے عہدے سے کراچی شپ یارڈ کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ حاصل کی اور ان کے روزگار کا ایک طویل سفر جو انھوں نے کراچی سے شروع کیا تھا اپنے اختتام کو پہنچا۔ بعد میں کچھ عرصے کے لیے وہ ایک تعلیمی ادارے 'فلیم' میں جنرل منیجر رہے اور محمد علی جناح یونیورسٹی، کراچی کے 'شعبہ سوشل سائنسز' میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بھی رہے۔ ملازمت کے بعد بھی انھوں نے فارغ بیٹھنے کی بجائے کام پر اپنا وقت صرف کیا ہے اور زندگی کی آخری سانس تک ان کے اندر کام کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ اسی جذبے کے تحت آج کل وہ معروف صحافی جناب محمود شام کے ساتھ روزنامہ جہان پاکستان میں بحیثیت کالم نگار شامل ہیں:

آخری عمر تک ساتھ نہ چھوڑوں گا ترا
زندگی تجھ سے یہ وعدہ مرا مرنے تک رہے

۷۔ازدواجی زندگی

جولائی ۱۹۷۶ء میں جمال نقوی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ان کی زوجہ پروفیسر نسرین نقوی صاحبہ (صدارتی ایوارڈ یافتہ) بھی انجینئر ہیں۔ انھوں نے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم برطانیہ اور امریکہ سے حاصل کی۔ ان کے خاندان میں خاندان سے باہر رشتے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن اسی بات پر والدہ کو راضی کرلیا گیا کہ تعلیم یافتہ خاندان میں شادی سے بچوں کی تعلیم و تربیت اچھی ہوگی اور مستقبل کامیاب ہوگا۔ شادی کی تاریخ طے ہوئی مگر شادی سے چند روز قبل ڈاکٹروں نے اُن کو پلوریسی (جو کہ ٹی بی کی ایک قسم ہے) کا مریض قرار دیا۔ وہ ایک سال تک ٹی بی سینی ٹوریم کے ڈائریکٹر ڈاکٹر اقبال یاد کے زیرِ علاج رہے۔ مکمل صحت یابی کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ بیماری کے دوران ان کی نوکری ختم ہوگئی تھی اس لیے ان کو سخت قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ شادی کے موقع پر بھی مالی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال ان کی شادی ایک تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار لڑکی سے ہو گئی۔ ان کے دو بچے ہیں۔ بیٹا انجینئر علی دانش اور بیٹی ڈاکٹر تزئین زہرا۔ ان کی ازدواجی زندگی نے ان کو ذہنی سکون بھی دیا ہے اور کسی حد تک آئینِ زندگی بھی سکھا دیا ہے جس کو انھوں نے چار مصرعوں میں یوں قلم بند کیا ہے:

ہے تیرا نام باعثِ تسکین زندگی
تو نے سکھا دیا مجھے آئینِ زندگی
دانش بھی تیرے پاس ہے کیا اور چاہیے
تزئین زندگی میری نسرین زندگی(۲)

۸۔ادبی سفر

جمال نقوی نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی عمر میں ہی انھوں نے مشہور ادبی شخصیات کو اپنے قریب پایا۔ ان کے والد کو بھی ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے ڈپٹی

محمد عظیم صاحب کے دولت خانے پر منعقدہ ایک مشاعرے میں احتشام حسین صاحب کی صدارت میں پہلی بار اپنا کلام سنایا۔

۱۹۵۹ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد جب وہ انٹرمیڈیٹ میں آئے تو شاعری کی طرف ان کی رغبت کا سبب بیت بازی کے مقابلے تھے۔ یہیں سے ان کی شاعری کی ابتداء ہوئی۔ ان کی پہلی نظم جس میں انھوں نے اپنے والد کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ یوں ہے:

محبتوں کا وہ سایہ ہے
شفقتوں کا حصار
کہ جس نے سب غم و آلام سے بچایا ہے
مری بھلائی کی خاطر
مری خوشی کے لیے
نہ جانے کتنے مصائب کو خود اُٹھایا ہے
مگر صلے کی تمنا
نہ اجر کی خواہش
اب اس کے بعد میں جب اپنے فرض کو دیکھوں
تمام عمر بھی چاہوں تو حق ادا نہ ہو
بس اک دُعا ہے کہ کچھ ایسا کام کر جاؤں
شفیق باپ کا دُنیا میں نام کر جاؤں (۳)

اس سے پہلے اپنی والدہ کو انہوں نے اس طرح خراج تحسین پیش کیا تھا:

اک محبت کا سایہ مرے سر پہ ہے
جو مجھے تیز شعلوں سے
برقِ تپاں سے

اور دنیا کی ہر آفتِ ناگہاں سے
اپنا سب کچھ لٹا کر بچاتا رہا
میرے ہر ہر قدم کی خوشی کے لیے
التجاؤں، دعاؤں کی جھولی لیے
محوِ تقدیسِ رب ہے (۱۷)

ان کے والد نے اُن کو اپنے دوست شدید لکھنوی کے پاس بھیج دیا، جنھوں نے کلام پڑھ کر اساتذہ کا کلام پڑھنے اور مشقِ سخن جاری رکھنے کی رائے دی۔ یہ ذکر چھٹی دہائی کا ہے جو طرحی غزل ان کی خدمت میں پیش کی تھی، اس کے چند اشعار دیکھیے:

روش روش پہ فضا خوشگوار ہے ساقی
چمن میں آج مکمل بہار ہے ساقی
نگاہ در پہ تصور میں جام و پیمانہ
کچھ اس طرح سے تیرا انتظار ہے ساقی
غزل وہ چھیڑ کہ جس سے سرور آ جائے
ہوا کے دوش پہ ابرِ بہار ہے ساقی
وہ اور ہوں گے جنھیں تجھ سے کچھ شکایت ہے
ترے کرم پہ ہمیں اعتبار ہے ساقی
مجھے تو ہوش نہیں دامن و گریباں کا
یہ سن رہا ہوں چمن میں بہار ہے ساقی (۴)

جمال نقوی کالج میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اس میگزین میں انھوں نے ''نذرِ کالج'' کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی جو شائع بھی ہوئی تھی۔ اس نظم کے دو اشعار

ملاحظہ فرمائیں:

مرے کالج تری اعجاز نوائی کے نثار
رحمتیں عام تری سارے زمانے کے لیے
تری آنکھوں میں تعصب کا ذرا نام نہیں
فیض تعلیم ترا عام زمانے کے لیے(۵)

وہ انجینئرنگ کالج کی میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے اور مسلم یونی ورسٹی کی اردو میگزین میں بشیر بدر صاحب کی ادارت میں مجلسِ ادارت کے ممبر بھی رہے۔ علی گڑھ کے قیام نے ان کو ہندو پاک کے ادبی جرائد سے روشناس کرایا اور ان کا کلام لکھنؤ، الہ آباد اور علی گڑھ کے رسائل میں شائع ہونے لگا۔

اس طرح مادرِ علمی، علی گڑھ نے ان کو ایک کامیاب انجینئر بھی بنا دیا اور ان کے ادبی ذوق کو جلا دے کر ایک مکمل شاعر بھی بنا دیا۔ ان کی اب تک ۳۴ سے زائد کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں تحقیق و تنقید شعری مجموعے، نثری تالیف، سائنسی مضامین اور تراجم شامل ہیں۔

vii۔ اعزازات

ان کو بحیثیت ادیب بہت سے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ذیل میں مذکورہ اعزازات کی تفصیل ملاحظہ ہو:

- ☆ نشانِ سپاس، انجمن ترقی پسند مصنفین، پاکستان، ۲۰۱۳ء
- ☆ فیض ایوارڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۲ء
- ☆ پلاٹینم جوبلی ایوارڈ، انجمن ترقی پسند مصنفین، ۲۰۱۱ء
- ☆ نشانِ اعزاز (تیسرا انعام برائے فیض کا فکری ابلاغ) ۲۰۱۱ء

- ☆ نشانِ اعزاز (دوسرا انعام برائے مجنوں گورکھپوری شخصیت و فن) ۲۰۱۰ء
- ☆ شیلڈ برائے مقالہ نگار، ۷ ویں قومی سیمینار، آئی وی۔ پی ۲۰۱۰ء
- ☆ نشانِ اعزاز (خصوصی برائے 'بلاوا') ۲۰۰۹ء
- ☆ مجنوں گورکھپوری ایوارڈ ۲۰۰۸ء
- ☆ نشانِ اعزاز (خصوصی انعام برائے، ترقی پسند تحریک ادب اور سجاد ظہیر) ۲۰۰۶ء
- ☆ نشانِ اعزاز (پہلا انعام برائے نقد و شخص) ۲۰۰۵ء
- ☆ سجاد ظہیر ایوارڈ، ۲۰۰۵ء
- ☆ سر سید احمد ایوارڈ، ۲۰۰۳ء
- ☆ بہترین مؤلف قائدین پاکستان، ۲۰۰۱ء
- ☆ بہترین ہائیکو نگار، نغمے سورج دیس کے، ۲۰۰۰ء
- ☆ بہترین مدیر فیڈریشن آف انجینئرنگ انسٹی ٹیوشن آف اسلامک کنٹریز، ۱۹۹۹ء
- ☆ اکادمی ایوارڈ برائے ادب اور سائنس، ۱۹۹۸ء
- ☆ آئی ای پی قائداعظم ایوارڈ، ۱۹۹۷ء
- ☆ پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ، برائے سائنس و انجینئرنگ، ۱۹۹۵ء
- ☆ تخلیق ایوارڈ، برائے شاعری، ۱۹۹۳ء
- ☆ لوحِ اعزاز، برائے ادب، ۱۹۹۲ء
- ☆ میڈل، برائے حسنِ کارکردگی ۱۹۹۱ء

viii۔ تصانیف

جمال نقوی کی اب تک ۳۴ سے زائد کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔

گلہائے عقیدت

اردو میں ان کی پہلی کتاب گلہائے عقیدت کے نام سے منظر عام پر آئی، جو کہ منقبت کے مجموعوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔

مکان شیشے کا

ان کی دوسری کتاب دو سال کے وقفے کے بعد ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آئی۔ جمال نقوی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے آنکھ ہی ایک پُر آشوب زمانے میں کھولی، جہاں واقعات اور حادثات کی تیز آندھیاں کسی کو بھی پختہ وردیرپا زندگی قائم نہیں کرنے دیتیں بلکہ اگر دتی ایک بارلٹتی ہے تو کسی اور نگر میں کوئی نہ کوئی عی گزھ کالونی بھی نفرتوں کی بھڑکی آگ کی نذر ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اس کے تمام تر اضافہ حیثیت کا عنوان پھر یہی شعر تو ہو گا نا کہ:

بنا لیا ہے جو ہم نے مکان شیشے کا
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے

انجینئرنگ ہورائزن

کتاب ان کے انجینئرنگ کے موضوع پر شائع ہونے والے مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کے مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل میں انجینئرنگ ہورائزن کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کے انگریزی مضامین کا یہ مجموعہ ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔

ادب اور سائنس

ادب اور سائنس جمال نقوی کی نثری تالیف ہے۔ اس میں انھوں نے ادب اور سائنس کے باہمی تعلق پر مضامین کو یکجا کیا ہے۔ ادب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے یہ سلسلہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے تب سے جاری ہے۔ سائنس اور ادب میں قدر مشترک انسان ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم متوازی اور بہتر زندگی کے لیے

ادب اور سائنس کو مثبت انداز میں استعمال کریں تاکہ انسانیت کی فلاح ہو۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے۔

ننھے سورج دیس کے

معروف شاعر جمال نقوی کے طبع زاد ہائیکو کی منفرد کتاب "ننھے سورج دیس کے" ایک منفرد مجموعہ ہے۔ منفرد اس لحاظ سے کہ ان کی طبع زاد اور اردو ہائیکو کے انگریزی تراجم سہیل احمد صدیقی نے اور جاپانی تراجم شگیو کی اتاکا نے کیے ہیں۔ ننھے سورج دیس کے مختلف حصوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جمال نقوی کے ہائیکو خوبصورت حسیات کے ساتھ ہماری زندگی کی بہترین تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب جاپان اور پاکستان کے درمیان دوستی میں اضافے کا سبب بنے گی۔ اس کا اظہار شاعر نے یوں کیا ہے:

دوستی کا پیغام
یہ ننھے سورج دیس کے
ہائیکو ان کا نام

قائدین پاکستان

یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں پاکستان کے قائدین کے متعلق مفصل تفصیل موجود ہے۔ اس کتاب کے مضامین میں ہمیں پاکستان کی پوری تاریخ نظر آتی ہے۔ مختلف مصنفین کے مضامین کی تالیف کا کام جمال نقوی نے انجام دیا ہے۔

مزاج سخن

غزل کو بلاشبہ اردو کی مقبول ترین صنف سخن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ وہ شعراء بھی جو شاعری میں مقصدیت کی تلاش کے لیے سرگرداں نظر آتے ہیں غزل کی شعری روایت سے اپنا دامن چھڑانے میں ناکام رہے۔ آخرکار انھوں نے بھی غزل کے دائرۂ کار میں رہ کر مقصدیت کی تلاش کی۔ حالی کی روایت سے شروع ہونے والا یہ سفر تاحال جاری ہے۔ اس عظیم ساخت کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے جو شعراء آج معروف عمل ہیں ان میں سے ایک نام جمال نقوی کا بھی ہے۔ یہ مجموعۂ کلام غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی:

جمال اب بھی تلاش معاش سے آگے
بہت سے اور ہیں محبوب مشغلے میرے

ادب، سائنس اور جمہوریت

زندہ حقائق پر مشتمل کتاب ادب سائنس اور جمہوریت جمال نقوی کی علمی و ادبی بصیرت کا بہترین نمونہ ہے۔ کتاب کیا ہے بقول میر: ''عالم کی سیر میر کے دیواں میں ہوگئی'' سرسید مرحوم پر فکر انگیز مضمون جمال نقوی کی علمی بصیرت کی گواہی ہے۔ سرسید نے اپنے دور کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے جو شمع روشن کی تھی وہ آج بھی فروزاں ہے اور تاقیامت سرسید کو منوانے کے لیے کافی ہے۔ قاضی نذرالاسلام، اختر حسین رائے پوری، احمد صدیق مجنوں گورکھپوری، اسرارالحق مجاز پر جمال نقوی نے بہترین مضمون تحریر کیے ہیں۔ یہ الصنا تنقید کی کتاب ہے جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔

نقد و نظر

اس کتاب میں مصنف کے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ عملی تنقید کے یہ مضامین زیادہ تر تعارفی نوعیت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انحصار سے سیدھے سادے انداز میں تجزیاتی و

تاثراتی تنقیدی مضامین لکھنا بھی وسیع مطالعہ کے بنا ممکن نہیں۔ اس لیے پچاس سے زیادہ ادبی شخصیات اور ان کی تصانیف کا یہ تجزیہ دل چسپ اور معلوماتی نقد ادب کا آئینہ ہے، جس کے پیش لفظ میں شفیق احمد شفیق نے بڑی جامعیت سے ان محاسن کا ذکر کیا ہے جو مصنف کے اندازِ بیاں اور مبلغ علم سے تعلق رکھتے ہیں۔ بقول ان کے پرکھنے اور رائے دینے کا طریقہ سنجیدہ اور عالمانہ ہے۔ نقطۂ نظر بنیادی طور پر ترقی پسندانہ ہے مگر یک رُخا نہیں بلکہ کشادہ نظری کا غماز ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب پر ان کو اعزاز بھی دیا گیا۔

ترقی پسند تحریک۔ ادب اور سجاد ظہیر

ترقی پسند تحریک ادب اور سجاد ظہیر ان کی تنقید کی کتاب ہے جس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک اور سجاد ظہیر کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے چونکہ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے اہم بنیاد گزار تھے اس لیے ان پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب صد سالہ جشن سجاد ظہیر کے موقع پر ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ان کو نشانِ اعزاز کے خصوصی انعام سے بھی نوازا گیا۔

کہانیاں دیس دیس کی

یہ کتاب تراجم پر مبنی ہے جو کہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے کیے گئے ہیں۔ کسی دوسری زبان سے اُردو یا کسی اور زبان میں کہانیوں کا ترجمہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ ترجموں میں اوریجنل تاثرات کا قائم رہنا اور زبان میں ان کا ترجمہ کرنا ایک مشکل کام بلکہ فن ہے اور یہ فن

جمال نقوی کے پاس موجود ہے یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں منظرِ عام پر آئی۔

جمال وکمال

جمال و کمال ان کی یادداشتوں پر مبنی کتاب ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آئی۔ کسی بھی ادیب کی خودنوشت جہاں نئے آنے والوں کو فائدہ دیتی ہے وہیں سماج اور معاشرے کی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس لیے خودنوشت سے جہاں ہمیں ایک فرد کی شخصیت کے نشیب و فراز سے آگاہی ہوتی ہے۔ وہیں اس سے سماجی تاریخ کے ایک دور کا بھی پتہ چلتا ہے اور پھر یوں ہے:

سناؤ حال پھر عمر رواں ملے نہ ملے
کہو جو کہنا ہے کل پھر زبان ملے نہ ملے

مجنوں گورکھپوری شخصیت وفن

مجنوں گورکھپوری شخصیت وفن ان کی تنقید کی کتاب ہے، جس میں انھوں نے احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کی شخصیت پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے اور ترقی پسند تحریک کے تناظر میں ان کے فن کو بھی بیان کیا ہے۔ اس کتاب پر جمال نقوی کو نشانِ اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کی ہے۔

ترقی پسند تحریک کا سفر

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اس کتاب کے بارے میں تحریر کیا کہ ڈاکٹر جمال نقوی نے زیرِ نظر کتاب میں تحریک کے چند اہم سنگِ میل پر قدم اٹھایا ہے۔ جس سے اس تحریک کے ہمدرد اور محققین مستفید ہو سکیں گے۔ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جسے مستقبل کا مورخ نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا ہے۔

فیض کا فکری ابلاغ

فیض کا فکری ابلاغ، تنقید کی کتاب ہے۔ فیض چونکہ ترقی پسند شاعر تھے۔ اس لیے ان کی شاعری کے فکری ابلاغ کو ترقی پسند تحریک کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ اس کتاب پر مصنف کو نشانِ اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ یہ کتاب فیض صدی تقریبات کے موقع پر ۲۰۱۱ء میں پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی نے شائع کی ہے۔

دھنک رنگ

دھنک رنگ جمال نقوی کا منتخب شعری مجموعہ ہے جس میں منتخب کلام کی سات اصناف کا سات زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف زبانوں میں ترجمہ کردہ کلام دھنک کے رنگوں کی طرح خوبصورت اور نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۲ء میں منظرِ عام پر آئی۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی ــــ شخصیت اور فن

اس کتاب میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے ہے۔ اس لیے ان کی ادبی خدمات کا جائزہ ترقی پسند تحریک کے تناظر میں لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۲ء میں تحریر کی گئی ہے اور اکادمی ادبیات پاکستان میں زیرِ اشاعت ہے۔

ترقی پسند اُردو نثر کے پچاس سال

ترقی پسند اُردو نثر کے پچاس سال ان کی پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع ہے جو کہ ایک تحقیقی مضمون ہے۔ اس مقالے کو کتابی شکل میں مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے شائع کیا

ہے جو کہ ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر انوار احمد نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب پر ۲۰۱۲ء میں انہیں نشانِ اعزاز سے نوازا گیا۔

ترقی پسند ادب کے معمار

اس کتاب میں مصنف نے ان قلم کاروں کا تذکرہ کیا ہے جو ترقی پسند تحریک کا حصہ رہے ہیں اور جنھوں نے ترقی پسند ادب کے فروغ کے لیے ادب تخلیق کیا۔ یہ کتاب تذکرہ نگاری پر مشتمل ہے اور کتاب ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ اسے بھی انجمن ترقی پسند مصنفین 1
پاکستان نے شائع کیا ہے۔

شخصیت

ہر فرد اپنا ایک مخصوص تشخص رکھتا ہے۔ لغوی طور پر شخصیت اگرچہ کسی فرد کا ظاہری حلیہ کہلاتا ہے لیکن اپنے وسیع تر مفہوم میں شخصیت کے اندر باطنی صفات بھی شامل ہیں۔ کسی فرد کا تشخص محض اس کی ظاہری ساخت سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی سیرت و کردار کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی شخصیت سے جہاں ظاہری طور پر متاثر یا بے زار ہوتے ہیں وہاں اس کی باطنی صفات بھی ہمیں اپنی طرف کھینچتی یا گریز پر مجبور کرتی ہیں۔

جہاں تک جمال نقوی کی ظاہری شخصیت کی بات ہے تو ان کی رنگت گندمی ہے، متوسط قد ہے اور سیدھے بال ہیں۔ آنکھیں چمک دار ہیں جس سے ان کی ذہانت عیاں ہوتی ہے۔ ستواں ناک ارادوں میں پختگی کو ظاہر کرتی ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کے لہجے میں سنجیدگی واضح دکھائی دیتی ہے۔ ظاہری وضع قطع میں سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ جمال نقوی کی باطنی شخصیت میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ دوسروں کے دُکھ اور تکالیف کو شدت سے محسوس کرتے ہیں وہ انتہائی منکسار اور خوش اخلاق

انسان ہیں۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر دوسروں کے کام آنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ جمال نقوی کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ حق بات کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اگرچہ اپنی حق گوئی کی وجہ سے بار ہا ان کو نقصان بھی اُٹھانا پڑا مگر انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اپنی صداقت پر قائم رہے ہیں۔

جمال نقوی ایک حساس انسان ہیں۔ ہر عام انسان کی طرح ان کی زندگی میں ہونے والے واقعات نے ان کی ذات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کی زندگی کا اہم واقعہ ان کی بیٹی کی طلاق کا ہے اس واقعے نے ان کی بیٹی کے ساتھ ساتھ ان کو بھی ذہنی طور پر متاثر کیا ہے۔

اس واقعے کی تفصیلات وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ ہوا یوں کہ میری بیٹی نے جب ایم بی بی ایس کا کورس مکمل کر لیا تو اسے سرجری میں آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ جانے کی خواہش ہوئی۔ اس سلسلے میں اس نے PLAB کا امتحان بھی پاس کیا۔ ہم دونوں میاں بیوی پریشان تھے کہ اسے اکیلے کیسے بھیجا جائے۔ اس درمیان لندن میں موجود ڈاکٹر کا رشتہ آیا۔ تحقیقات کے بعد ہم نے بچی کی شادی کر دی۔ شروع میں سسرال والے ٹھیک رہے دونوں میاں بیوی خوش تھے۔ دو ماہ بعد بچی کے سسر مع بیگم کے لندن گئے تا کہ بچوں کو آبادکاری میں مدد دیں وہاں پہنچ کر انھوں نے مجھے فون کیا کہ نقوی صاحب یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ اپنی بچی کو واپس بلالیں ہم نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بچی کو واپس بلالیا۔ روانگی سے قبل اسے مجبور کیا جاتا رہا کہ وہ سادے کاغذ پر دستخط کر دے مگر اس نے منع کر دیا ان لوگوں نے اس کا جہیز کا سامان۔ اس کا مہر اور اس کے زیورات کچھ بھی واپس نہیں دیا بلکہ اس کے آتے ہی طلاق نامہ بھیج دیا اور پھر اس پر کیس کر دیا۔ تب ہمیں بھی وکیل کرنا پڑا۔ کیس چل رہا ہے۔ بچی اس حادثے سے ذہنی بیمار ہوگئی ہے جسے علاج اور تیمارداری سے بمشکل اس ٹینشن سے نکالا جا سکا ہے۔ اس حادثے نے ہمیں بہت جلد بوڑھا

کر دیا ہے لیکن اس درمیان بہت سے چہروں سے نقابیں بھی ہٹی ہیں اور اصلی چہرے سامنے آئے ہیں۔

یہ حادثات ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں ورنہ وقت تو گزر ہی جاتا ہے، مجھے خوشی ہے کہ وقتی مصیبتوں کے عوض یہ حادثات بہت کچھ سکھا گئے مجھ کو۔''

اپنے ذاتی دُکھوں کے علاوہ معاشرتی دُکھوں نے بھی ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، جس میں وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی بے حسی کو دیکھتے ہیں۔ معاشرتی بے حسی کا ایک نمونہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں بس میں سوار کہیں سے آ رہا تھا۔ بس ڈرائیور اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے مسافروں کی زندگی کی پرواہ نہیں کر رہا تھا اور اس کا کنڈیکٹر مسافروں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آ رہا تھا۔ ایسے میں ایک بزرگ نارتھ ناظم آباد کے ایک سٹاپ پر اُترے۔ ڈرائیور نے اسپیڈ کم کی اور فوراً ہی تیز کر دی جس سے وہ بزرگ سڑک پر گر گئے۔ میں نے ڈرائیور سے احتجاج کیا تو اس نے گالیاں بکنی شروع کر دیں اور کنڈیکٹر نے مجھے پکڑ کر نیچے گرانا چاہا۔ بس رُک گئی۔ ہم نیچے آ گئے اور لڑنے لگے۔ بے حسی کا یہ عالم تھا کہ کوئی مسافر میرا اور حق کا ساتھ دینے نیچے نہ اُترا۔ کنڈیکٹر نے مجھے نیچے گرا دیا۔ اس دوران ڈرائیور ایک سریا لے کر آ گیا اور وہ چاہتا تھا کہ مجھے زخمی کرے کہ غیبی امداد آ گئی۔ علاقے کے کچھ نوجوان وہاں پہنچ گئے جنھوں نے ان دونوں کو پکڑ کر مارا اور پھر میں بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو گیا۔ مگر اس کے بعد سے بہت محتاط ہو گیا ہوں اسی واقعے کی یاد میں اپنی نظم ''بے حسی'' تحریر کی جو ماہنامہ ''افکار'' میں شائع ہوئی اور اتنی پسند کی گئی کہ بعد میں وہ افکار ہی کے پچاس سالہ منتخب شاعری نمبر میں بھی شامل ہوئی۔

مجھے یوں آج کل محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے زندگی
بس قتل و خوں سے ہی عبارت ہے

سحر ہوتے ہی
جو اخبار دیکھو
جنگ اغوا اور ڈکیتی
سے بھرا ہوگا
اگر ٹی وی کو کھولو گے
تو اس میں
ٹینک، توپیں اور بندوقیں ہی
انسانوں کا خوں پیتی نظر آئیں گی
اگر سڑکوں پہ نکلو گے
تو ہر بس دوسری بس سے
ذرا آگے نکل جانے کی کوشش میں
نہ جانے کتنی ہی جانوں سے کھیلے گی
ہماری بے حسی سے ہی
یہ حالت روز ہوتی ہے
اسی باعث نہ کوئی کام رُکتا ہے
نہ کوئی آنکھ روتی ہے" (۶)

انھوں نے اپنی تحریروں میں ادب اور سائنس کے باہمی رشتے کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سائنسی ایجادات نے جہاں زندگی کو آسان بنا دیا ہے وہاں ان کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ دورِ جدید میں کمپیوٹر انسان کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔ کمپیوٹر کے ہماری زندگیوں پر جو اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کو اپنی نظم میں انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

"کمپیوٹر کو دے دیں میں نے

اپنی ساری یادیں

اور خوش تھا

کہ ذہن کو اب

آرام و سکون ملے گا

لیکن ظالم وائرس کو

آرام نہ میرا بھایا

اس نے چپکے چپکے

میری سب یادوں کو کھایا"(۷)

ڈاکٹر قمر رئیس جمال نقوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"جمال نقوی کے احساس کی دردمند آواز اور حسن آفریں تمثیل کی پرواز ان کی اپنی ہے جو چھوٹی چھوٹی نظموں میں آج کی برہنہ حقیقتوں سے آنکھیں ملا کر ایک الگ پہچان بنا رہی ہے۔ ان میں ان کی انفرادیت زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔"(۸)

جمال نقوی کا تعلق سائنس کے ساتھ ہے اور وہ ایک کامیاب انجینئر ہیں۔ اس تناظر میں ان کا ادب کے ساتھ رشتہ ایک خوشگوار تاثر چھوڑتا ہے۔ کیفی اعظمی کا کہنا ہے کہ:

"سائنس اور ٹیکنالوجی کے زیور سے آراستہ ہونے کے باوجود شعر و ادب سے آپ کی محبت میرے لیے باعث تقویت ہے۔ لکھنؤ اور علی گڑھ سے حاصل کردہ شعور و آگہی کے ذریعے اپنے اس ادبی سفر کو جاری رکھیں مستقبل آپ کا منتظر ہے۔"(۹)

جمال نقوی نے شاعری اور تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ تراجم بھی کیے ہیں جو کہ ایک

مشکل صنفِ سخن ہے مگر وہ اس میں کامیاب رہے ہیں۔ ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بہر حال ایک مشکل امر ہے۔

جمال نقوی کے فنِ ترجمہ کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے کچھ یوں ملتی ہے:

"جمال نقوی نے جو تراجم کیے ہیں وہ اس لحاظ سے مثالی ہیں کہ میرے لیے اُردو میں اتنے سچے اور بھرپور منظوم تراجم کی کوئی دوسری مثال پیش کرنا مشکل ہے ان کی طبع زاد نظموں میں بھی وہی حقیقت افروزی اور فنی گٹھاؤ ہے جو ان کے تراجم میں ہے۔" (۱۰)

جمال نقوی ایک حساس شاعر ہیں اور ان کی شاعری دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں کہ:

"جمال نقوی کی شاعری عصری آگہی کا حصہ بھی ہے اور تصوراتی صورتوں کو جانی پہچانی تصویروں میں پیش کرنے کے اعتبار سے لائقِ تحسین بھی۔ ان کے انفرادی احساسات اور اجتماعی میلانات سے زندگی کی پرکھ ہوتی ہے جو فن کا ایک اہم حصہ ہے۔" (۱۱)

شعر و ادب کے گہوارے لکھنؤ میں جمال نقوی نے آنکھ کھولی اور مادرِ علمی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی جس نے ان کے شاعرانہ ذوق کو جلا بخشی۔ ڈاکٹر سحر انصاری کا کہنا ہے کہ:

"جمال نقوی کو لکھنؤ کی پیدائش اور علی گڑھ کی تعلیم نے شاعر بنایا۔ وہ خلوص کے ساتھ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔" (۱۲)

حوالہ جات

۱۔ جمال نقوی، ڈاکٹر، جمال و کمال، کراچی: خیال پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰

۲۔ ایضاً، ص ۴۱

۳۔ ایضاً، ص ۱۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۳

۶۔ ایضاً، ص ۴۳

۷۔ ایضاً، ص ۵۲

۷۔ اے۔ ماہنامہ تحریریں لاہور، اگست ۱۹۷۳ء، ص ۱۵

۸۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، سہ ماہی خیال، (جمال نقوی نمبر)، کراچی: جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۹

۹۔ کیفی اعظمی، ایضاً

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، ایضاً

۱۱۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، ایضاً

۱۲۔ سحر انصاری، پروفیسر، ایضاً، ص ۲۰۰

باب دوم

جمال نقوی کا شعری سفر

جمال نقوی کی غزل

جمال نقوی کی غزل گوئی پر اظہار خیال کرنے سے پہلے غزل کے عموی مباحث کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے اور غزل کے آغاز وارتقا سے پہلے اِس کے لغوی و اِصطلاحی معانی کا تعین کرنا ضروری ہے۔

اُردو غزل کا مختصر جائزہ

غزل کے لغوی معنی نوراللغات کے مطابق درج ذیل ہیں:

''عورتوں سے باتیں کرنا، اِصطلاح میں وہ اشعار جنھیں حسن وعشق، وصال، فراق، ذوق، اشتیاق، جنون ویاس وغیرہ کی باتیں جو عشق سے متعلق کہی جائیں۔''(۱)

ڈاکٹر سہیل احمد خاں لکھتے ہیں:

''غزل کا ہر شعر اپنے مضمون اور خیال کے حوالے سے مکمل ہوتا ہے اس کے مضمون وخیال کا کوئی تعلق دوسرے اشعار سے نہیں ہوتا۔ یوں غزل، خیال، موضوع اور معانی کے لحاظ سے تنوع کی حامل ہوتی ہے۔ یہ منتشر الخیالی ہی غزل کی قوت اور پہچان ہے۔''(۲)

غزل صرف عشق و محبت کی باتیں نہیں ہے بلکہ ہمہ گیریت کی حامل صنف ہے اس صنف سخن میں زندگی کے ہر موضوع پر بات ہو سکتی ہے۔ حیات و کائنات کے مسائل کا تذکرہ بھی غزل میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ موضوعات میں تنوع کی وجہ سے یہ ایک خوبصورت گلدستے کا منظر پیش کرتی ہے جس میں مختلف رنگوں کے پھول ایک تناسب کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور ان کا خاص تناسب ہی گلدستے کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث بنتا ہے تو گویا قاری جب غزل پڑھتا ہے تو اس پر بھی یہی تاثر پڑتا ہے کیونکہ غزل کا ہر شعر فکری لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، کبھی شاعر غزل کے پہلے شعر یعنی مطلع میں محبوب سے جدائی کے کرب کو بیان کرتا ہے۔ تو دوسرے میں وصل کے پُر لطف لمحات کا ذکر کرتا ہے تو غزل کے تیسرے شعر میں محبوب کی خوبصورتی کو بیان کرتا نظر آتا ہے۔

غزل ابتدا میں عربی قصیدے کی تشبیب تھی۔ قصیدہ جو کہ اُردو شاعری کی اہم صنف ہے جس کا آغاز دور جہالت میں عرب میں ہوا۔ عربی شاعری سے یہ فارسی میں پہنچا اور فارسی کے ذریعے اُردو میں آیا۔ فارسی قصیدہ میں بھی غزل بدستور موجود رہی لیکن بعد میں اس کو قصیدے سے الگ کر کے ایک مستقل صنف بنا دیا گیا۔

خطہ پاک و ہند میں غیر ملکی لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے یہاں کی زبانوں اور بولیوں میں تبدیلی آنے لگی جو بالآخر اُردو کی صورت میں سامنے آئی جب اُردو شاعری نے آنکھ کھولی تو اس کے سامنے فارسی کی مثال تھی۔ چنانچہ اُردو نے اس کو اپنا لیا یہی وجہ ہے کہ اُردو غزل کا ابتدائی دور گویا فارسی غزل گوئی کے ترجمے کا دور تھا۔ اُردو غزل کا باقاعدہ آغاز دکن سے ہوتا ہے۔ دکن کی ایک ریاست کے سلطان قلی قطب شاہ کو اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھا جاتا ہے مگر ولی دکنی کو اُردو غزل کا "باوا آدم" کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے باقاعدہ طور پر غزل کو اس کے فنی محاسن اور ہیئت کے اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت بخشی۔

ولی دکنی کی ہی بدولت شمالی ہندوستان میں اُردو غزل گوئی رواج پائی جب ان کا کلام

پہلی دفعہ دلّی پہنچا تو اس دور کے اساتذہ فارسی نے اس بات کو محسوس کیا کہ زبان ریختہ میں بھی خیالات لطیف کو ادا کیا جا سکتا ہے پھر ان اساتذہ نے فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی کسی حد تک نوازنا شروع کر دیا جن لوگوں نے ولی دکنی کی پیروی کرتے ہوئے اُردو غزل میں طبع آزمائی کی ان میں شاکر ناجی مضمون مرزا مظہر جان جاناں اور آبرو وغیرہ شامل ہیں۔ اسی دور میں ایہام گوئی تحریک چلی بعد میں خود شعرا نے ہی ترک کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک دلی اُردو غزل کا مرکز رہا مگر جنگ آزادی کے بعد غزل کی بحث دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی میں منقسم ہوگئی۔ دہلوی شعرا کے کلام میں سوز و گداز، غم دوراں، تصوف اور عشق کی سچی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان پر جو مصیبتیں ٹوٹتی رہیں۔ دلّی اس سے بہت متاثر ہوتا رہا اور یہاں رہنے والے اہل علم و ہنر لوگ ان مصائب کا شکار ہوتے رہے۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ہنگامہ اور پھر اس میں مجاہدین کا شکست سے دوچار ہونا ایسے واقعات تھے جو کسی صورت بھی ذہنی زلزلے سے کم نہ تھے۔

اس ہنگامہ کے برپا ہونے سے پہلے کے حالات بھی ناساز تھے۔ سودا، میر تقی میر اور خواجہ میر درد کا زمانہ بہت پُر آشوب تھا۔ میر و سودا کے دور کو عہد زریں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُس عہد میں صنف غزل نے بہت ترقی کی۔ میر و سودا کے بعد غالب و مومن اور ذوق کا زمانہ آتا ہے۔ اس دور میں شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن اور بہادر شاہ ظفر مشہور غزل گو شعرا تھے۔ غالب نے اُردو غزل میں فارسی تراکیب استعمال کیں اور اُردو غزل فارسی غزل سے آنکھ ملانے کے قابل ہوئی۔ غالب نے غزل میں طنز و مزاح کو جگہ دی ان کے خیالات میں جدت اور زبان میں خوبصورتی کے علاوہ ان کے انداز میں تغزل پایا جاتا ہے۔

دہلی کے برعکس لکھنؤ میں دولت کی ریل پیل تھی، خوشحالی تھی۔ یہاں کے لوگ کھیل تماشوں اور بیکاری کے اشغال میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے نزدیک شاعری بھی تسکین

اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ ان لوگوں کو دہلی کے لوگوں کی طرح مصائب کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا ان کے کلام میں سوز و گداز کی کیفیت نہیں پائی جاتی اور تصوف سے تو یہ لوگ ویسے ہی دُور رہے ہیں۔ حسن و عشق کے پہلوؤں کو ان لوگوں نے بہت نمایاں کیا۔ لکھنوی دبستان نے اپنی الگ نمایاں شناخت قائم کی جہاں داخلیت کی بجائے خارجیت پر زور ملتا ہے، مگر ان باتوں کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ والوں نے زبان کو صاف کیا اور اس میں خوبصورتی اور نکھار پیدا کیا۔ اس دبستان کے مشہور شعرا میں ناسخ، آتش، مصحفی، انشا اور رنگین شامل ہیں۔ ان کے بعد داغ اور امیر مینائی کا دور آتا ہے جن کی غزلوں کی دوسری خصوصیات کے ساتھ ساتھ نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کی غزلیں دہلی اور لکھنؤ کے خیالات کا حسین امتزاج ہیں۔ علامہ محمد اقبال کو ویسے تو نظم گو شاعر سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی غزلیں بھی اپنے اندر ایک خاص تاثیر رکھتی ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو برقرار رکھا اور اس میں گراں قدر اضافے بھی کیے۔ اصغر گونڈوی، جگر، فانی، حسرت اور شاد اہم ہیں۔ بعد ازاں فراق، حفیظ جالندھری، عابد، عدم، اُردو غزل کی دُنیا میں نئی آواز بن کر اُبھرتے ہیں۔ اس آواز کے ساتھ ساتھ کاظمی کا حزن و ملال اور فیض احمد فیض کی انقلابی لَے بھی شامل ہے۔ جدید غزل گو شعرا میں مجاز، احسان دانش، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی، جوش، ساغر صدیقی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، منیر نیازی، مجید امجد، جون ایلیا، پروین شاکر اور کشور ناہید وغیرہ شامل ہیں۔

جدید ترین شعرا میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، ریاض مجید، حزیں لدھیانوی، افتخار عارف اور خورشید رضوی قابلِ ذکر ہیں۔

جمال نقوی کی غزل کا فکری جائزہ

غزل جذبات و احساسات کے اظہار کے ذریعے کا نام ہے جب تک نسلِ انسانی کے

دل میں پیار اور محبت کے لطیف جذبات و احساسات پھوٹتے رہیں گے اس وقت تک غزل ان کے اظہار کا ذریعہ بنی رہے گی، جب تک حسن اس دُنیا میں رہے گا عاشق اپنے محبوب کی مدح سرائی کرتے ہیں گے جب تک انسان خواب دیکھیں گے اور انسان کے دل میں آرزو رہے گی۔ غزل کا وجود رہے گا۔

جمال نقوی نے غزل کی روایت سے انحراف نہیں کیا بلکہ اس روایت کو نبھایا ہے اور آگے بڑھایا ہے۔ انھوں نے اُردو غزل کی روایت کو اپنے انفرادی انداز سے مزید سنوار ا اور نکھارا ہے اور ان کی غزل شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں:

> "جمال نقوی کی شاعری مجھے پسند آئی۔ ان کا نکتہ نظر صحت مند رجائیت کا مظہر ہے ان کی شاعری اسی لیے قاری پر ایک خوشگوار تاثر چھوڑتی ہے۔"(۳)

جمال نقوی کی شاعری میں محض عشق و محبت کا بیان نہیں ہے بلکہ اپنے کلام میں انھوں نے انسانی دُکھوں کو بھی بیان کیا ہے اور دورِ جدید کے مسائل کو بھی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شاعر معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کو بھی مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور مختلف تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور یوں وہ مختلف کیفیات سے روشناس ہوتا ہے اور یہ کیفیات لفظوں میں ڈھل کر شاعری کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ شاعر چونکہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اشیاء اور رویوں کا مشاہدہ زیادہ باریک بینی سے کرتا ہے۔ غزل پہلودار ہوتی ہے جیسا کہ قدرت نے دُنیا کی ہر چیز کو پہلودار بنایا ہے۔ غزل بھی مختلف عناصر سے تشکیل عمل میں آتی ہے۔ ان عناصر کے مختلف رنگ باہم مل کر ایک نہایت دلکش قوسِ قزح کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔ ذیل میں ہم جمال نقوی کی غزل کے نمایاں موضوعات کا جائزہ لیں گے۔

عشق و محبت

لفظ عشق کے معنی و مفہوم فرہنگ کارواں میں کچھ یوں دیے گئے ہیں:

"حد سے زیادہ محبت و جنون کی کیفیت جو کسی حسین کے دیکھنے سے بیدار ہو۔
بعضوں کے خیال میں یہ لفظ عشقیہ سے ماخوذ ہے جو ایک قسم کی بیل ہے جو درخت سے لپٹ کر اُسے خشک کر دیتی ہے یہی حال عشق سے عاشق کا ہوتا ہے۔"(۴)

عشق و محبت آغاز سے ہی اُردو شاعری کا غالب موضوع رہا ہے۔ ہر دور میں شعرا نے محبوب سے اپنی محبت کا اظہار اپنے اپنے انداز میں کیا ہے۔ عشق و محبت کی باتوں کو ہر شاعر نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ہر شاعر کی طرح جمال نقوی کی شاعری میں بھی محبت کا رنگ دکھائی دیتا ہے، جس میں وہ کبھی محبوب سے محبت اور کبھی محبوب کی بے اعتنائی کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں:

مجھ کو منظور یہ بیماری دل ہے جس میں
وہ کبھی پوچھ تو لیتے ہیں کہ حال اچھا ہے(۵)

محبت کے فطری جذبے کو جمال نقوی نے خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے:

شرط اُلفت ہے کہ ہر ناز اُٹھایا جائے
لب پہ اک حرف شکایت بھی نہ لایا جائے(۶)

پھر انھوں نے شاعری کے روایتی انداز کو بھی اپنایا ہے جس میں عاشق اپنے محبوب کی ایک اُلفت بھری نظر کو بھی ترستا ہے۔ اُردو کی روایتی شاعری میں محبوب ایک سنگ دل انسان ہے جس پر عاشق کی آہ وزاری کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

کیوں لطف و کرم اب ہوتا نہیں مری جانب
کیوں بند عنایات کا دروازہ ہوا ہے(۷)

اس کے بعد انھوں نے محبت میں جدائی کے کرب کو بھی بیان کیا ہے، جو عاشق کو بے حال کر دیتا ہے اور اس کی تکلیفوں اور دکھوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

یاد آئی تری زخم کوئی تازہ ہوا ہے
اس درد جدائی کا اب اندازہ ہوا ہے(۸)

غرض جمال نقوی نے اپنی شاعری میں محبت کو زندگی کا لازمی جزو قرار دیتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جمال نقوی کے کلام کے بارے میں ڈاکٹر عالیہ امام یوں لکھتی ہیں:

''جمال نقوی کا کلام ایسی خوشبو ہے جو تپتی ہوئی زمین پر بارش کا پہلا قطرہ پڑنے کے بعد زمین سے پیدا ہوتی ہے۔''(۹)

بارش کے بعد زمین سے اُٹھنے والی خوشبو کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے اور یہی انفرادیت اور جدت جمال نقوی کے کلام میں نمایاں نظر آتی ہے۔

مزاحمت اور ترقی پسندی

جمال نقوی بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا جوہر مزاحمتی شاعری ہے ہر مزاحمت سیاسی، معاشی، معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف ہے وہ اپنے معاشرے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ تمام معاشرتی مسائل سے مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔ بحیثیت قوم ہم بے حسی کا شکار ہیں اور تمام برائیوں کو دیکھتے ہوئے بھی ہم نے اپنی آنکھیں اور کان بند کر رکھے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر خیال امروہوی کچھ یوں لکھتے ہیں:

''جمال نقوی کی شاعری میں ملک کے معروضی حالات کی شاندار ترجمانی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں جگہ جگہ ہمہ گیر تاثراتی اشعار کی کمی نہیں ہے۔''(۱۰)

آنکھیں دیکھیں کان سنیں پھر ہونٹ رہیں کیوں بند
کیسے اب خاموش رہیں پتھر بن جائیں ہم(۱۱)

دور ایسا آیا ہے جس میں سچ کا نہیں معیار
کس کو سچا سمجھیں کس پر دوش لگائیں ہم(۱۲)

انھوں نے اپنی شاعری میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافی، ظلم وجبر، اقرباپروری جیسی معاشرتی برائیوں کو بیان کیا ہے۔وہ موجودہ حالات کے تناظر میں کچھ یوں کہتے ہیں:

آج کے دور میں زندہ رہنا
سچ پوچھو تو ایک سزا ہے(۱۳)

اس شعر میں انھوں نے خوبصورتی کے ساتھ زندگی کی تمام تر ناانصافیوں کو بیان کیا ہے جس کی وجہ سے زندگی موت سے بھی بدتر ہوگئی ہے۔معاشرے میں انسانوں پر ہونے والے ظلم وستم کو انھوں نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

ہم پہ ہی صدیوں سے ہیں ظلم و ستم جبر و الم
اور ہمیں ہی مورد الزام ٹھہرایا گیا(۱۴)

وہ کہتے ہیں کہ انسان پر ہر دور میں ظلم وستم کا بازار گرم رہا ہے اور انسان ہی انسانوں پر ظلم کرتے نظر آتے ہیں۔

رجائیت

جمال نقوی کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں رجائیت ہے۔ ان کی شاعری میں ایک ایسے انسان کا عکس دکھائی دیتا ہے جو مصیبت کے وقت گھبراتا نہیں ہے۔ خواہ وہ عملی زندگی کا معاملہ ہو یا شعروفن کا۔ وہ شتر مرغ کی طرح مسائل کی ریت میں صرف سر چھپا لینے کی معصوم روش ہی کو مشکلات کا حل نہیں تصور کرتے بلکہ کٹھن وقت کی نظر سے نظر ملا کر جینا چاہتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی یہی جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ تیرگی کے طوفان میں چراغ بکف دکھائی دیتے ہیں۔

اِک انقلاب کا سودا جو دل میں رکھتے ہیں
وہ اپنی کشتی دل کو بھنور میں رکھتے ہیں(۱۵)

—

خود اپنے عزم و عمل کو اِک حوصلہ دینا
گزر گئے ہیں جو لمحے انھیں بھلا دینا(۱۶)

—

ہم ایسے شعلہ مزاجوں کا مشغلہ ہے یہی
فرازِ دار پہ بھی حرفِ حق سنا دینا(۱۷)

—

میری بے باک طبیعت نے یہ جرأت دی ہے
ظلم سے حق کے لیے لڑنے کی قوت دی ہے(۱۸)

ان اشعار میں جمال نقوی کی شاعری واقعی مایوسی کے اندھیرے میں حوصلے کی کرن ہے۔ ان کی شاعری انسانی رویوں، جذبوں اور اس کے تمام محاسن و معائب سے عبارت ہے وہ صرف مثبت قدروں ہی کے عکاس نہیں ہیں بلکہ منفی اقدار کے بھی ترجمان ہیں۔

سماجی رویے

جمال نقوی کی شاعری کا بنیادی موضوع انسان ہے۔ وہ انسان اور انسانی تقاضوں کو عالمی سطح پر دیکھنے کے قائل ہیں اور یہی وہ شاعرانہ اصول ہے جس سے ان کی انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے وہ بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر ہیں اور اس اعتبار سے وہ سماجی مسائل کو انسانی رشتوں کے حوالے سے نہ صرف سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ انھیں اپنی تخلیقی کاوشوں کا حصہ بنانے میں نہ تو کسی مصلحت کو راہ دیتے ہیں اور نہ کسی خواب اور نقصان کی پرواہ کرتے ہیں۔ ہمارے طبقاتی سماج میں غیر انسانی رویوں کی وجہ سے جو ناانصافیوں ہو رہی ہیں ان پر جمال نقوی نے قلم اُٹھایا ہے۔

مانا کہ بے مثال ترقی کا ہے یہ دور
پھر کیوں ہر ایک شخص کا چہرہ اُداس ہے (۱۹)

—

دل میں بے نام تیشے اُترنے لگے
اب تو ہر سانس ایذا رساں ہو گئی (۲۰)

—

اب مجھ کو اُجالوں کی کمی کا نہیں شکوہ
آنسو مری پلکوں پہ شراروں کی طرح ہیں (۲۱)

—

کہاں مسافر دشتِ بلا رُکے یارو
کہیں سکون میسر، نہ کوئی جائے اماں (۲۲)

ان اشعار میں انھوں نے سماجی رویوں کی بھرپور عکاسی کی ہے جو کہ معاشرے سے ان کی گہری وابستگی کو ظاہر کرتی ہے۔

ذوقِ عمل

جمال نقوی نے اپنی شاعری میں عوام اور خصوصاً نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے کہ اگر وہ ترقی کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں تو ان کو سخت محنت کی ضرورت ہے کیونکہ کسی بھی چیز کی بلندی کو حاصل کرنے کے لیے سخت اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ہمارا خوشحال معاشرے کا خواب اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ جب ہم بحیثیت قوم محنت کی عظمت کو جان لیں اور اپنے ذوقِ عمل کو تیز تر کر دیں۔

حوصلے اپنے جواں سارے سفر میں رکھنا
پیچ و خم راہ کے ہر وقت نظر میں رکھنا(۴۳)

پھر وہ رفتار کو تیز تر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ ہماری قوم دوسری قوموں کے ساتھ ترقی کی راہ میں شامل ہو سکے۔

تیز رفتار کیجیے، ورنہ
وقت کس کے لیے ٹھہرتا ہے(۴۴)

پھر یوں گویا ہوتے ہیں:

حالاتِ حاضرہ کا تقاضا ہے دوستو
تم بھی چلو تو وقت کی رفتار دیکھ کر(۴۵)

—

اس دور میں لازم ہے پیروں میں سفر رکھنا
سر میں کوئی سودا ہو ہاتھوں میں ہنر رکھنا(۴۶)

حرکت

جمال نقوی کی شاعری میں حرکت، تحرک کا موضوع بھی نظر آتا ہے۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ حرکت زندگی کے لیے ناگزیر ہے، اگر ٹھہر گئے تو زندگی ختم ہو جائے گی۔ حرکت سے

متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کبھی ناکامی سے گھبرائیں نہ ہمت ہاریں
ڈھونڈتا ہے جو کوئی شے کو تو مسلسل ڈھونڈیں (۲۷)

—

اپنی محنت سے مقام اپنا بناتا ہو گا
کوئی اچھا نہیں غیروں کے اثر میں رہنا (۲۸)

—

منجمد ہو کے نہ یوں برف کی مانند رہو
بزمِ ہستی میں ذرا دھوم مچا کر دیکھو (۲۹)

—

آیئے اپنے مسائل کا ذرا حل ڈھونڈیں
جو خوشی آج ہو ممکن اسے کیوں کل ڈھونڈیں (۳۰)

خود شناسی

جمال نقوی کے کلام میں اپنی ذات کا ادراک اور خود شناسی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو جاننا بھی ایک صلاحیت ہے۔ جمال نقوی اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ تقدیر خود ہماری محتاج ہوتی ہے جب ہم اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں تو پھر کیوں اپنی ناکامیوں کا ملبہ تقدیر پر ڈال دیتے ہیں۔

میں تو سر اپنا ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہوں
مجھ کو آتا ہی نہیں موت کے ڈر میں رہنا (۳۱)

خود شناسی اور شعورِ ذات کے حوالے سے اور بھی بہت سے اشعار ان کے کلام میں

دیکھے جاسکتے ہیں:

الفاظ میرے دیں گے گواہی کہ آج تک
جو کچھ کہا ہے میں نے وہ ڈر کر نہیں کہا(۳۲)

—

ہم کسی اور سے امداد طلب کیوں کرتے
خوب آتا ہے ہمیں اپنی حفاظت کرنا(۳۳)

اور پھر کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

خوشی کی بھیک بھی مانگیں نہ دوسروں سے ، مگر
خود آپ اپنے وسائل سے ہم سنور جائیں(۳۴)

جمال نقوی کی غزل: فنی جائزہ

ذیل میں ہم جمال نقوی کی غزلوں کا فنی جائزہ لیں گے۔

تشبیہ

تشبیہ کے لغوی معنی "مشابہت دینا" ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینا۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد خاں:

"کسی شے کے کسی وصف کو نمایاں کرنے کے لیے اُسے کسی ایسی شے کے مماثل قرار دینا جو وصف اس شے میں زیادہ ہو تشبیہ کہلاتا ہے۔" (۳۵)

جمال نقوی کے کلام میں تشبیہ کی خوبصورت مثالیں نظر آتی ہیں:

پھیل جاؤں گا میں خوشبو کی طرح دُنیا میں
دیکھتا ہوں کہ کرے کون گرفتار مجھے(۳۶)

استعارہ

استعارہ کے لغوی معنی مانگنا، اُدھار لینا وغیرہ ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد ہے کہ حقیقی اور مجازی معنی کے مابین تشبیہ کا علاقہ پیدا کرنا، یعنی ایک شے کو دوسری سے مماثلت کے باعث دوسری شے قرار دے دینا، استعارہ کہلاتا ہے۔ استعارہ کا خوبصورت استعمال ان کے کلام میں نظر آتا ہے:

مجھے کچھ اور ہی منظر دکھائی دیتا ہے
یہ شہر خوں کا سمندر دکھائی دیتا ہے(۳۷)

—

بنا لیا ہے جو ہم نے مکان شیشے کا
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے(۳۸)

صنعت تضاد

علم بدیع میں صنعت تضاد سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا جو ایک دوسرے کی ضد اور مقابل ہوں۔ جمال نقوی کے کلام میں حُسنِ تضاد کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

رو رو کے جان دینے سے کا کیا فائدہ جمالؔ
ہے زندگی سے پیار تو پھر مسکرایئے(۳۹)

دل نہ گھبرا کہ ابھی ترکِ تعلق تو نہیں
ان کو اقرار کی عادت بھی ہے انکار کے بعد(۴۰)

تلمیحات کا استعمال

تلمیح عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی رمز، اشارہ یا کنایہ کے ہیں۔ اصطلاح شاعری میں کلام میں، خاص لفظوں میں کسی خاص واقعے قرآنی آیات یا حدیث کی طرف اشارہ کرنا تلمیح کہلاتا ہے۔ جمال نقوی کے کلام میں تلمیحات کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔

زہر ہر سقراط کو ملتا رہا
ہر زمانے میں یہی ہوتا رہا(۴۱)

—

نہر کیوں کھود نہ لیں ہم بھی یہ مثل فرہاد
ہو جو پانی کی طلب کس لیے بادل ڈھونڈیں(۴۲)

—

ہر صدی میں قصہ منصور دہرایا گیا
سچ کہا جس نے اسے سولی پہ لٹکایا گیا(۴۳)

صنعت تکرار

کسی شعر میں مختلف الفاظ یا حروف کو تکرار کے طور پر لانا کہ اس میں خوبصورتی اور غنائیت پیدا ہو صنعت تکرار کہلاتا ہے:

چھائے ہوئے ہیں غم کے بادل
اور موسم دھندلا دھندلا ہے(۴۴)

صنعت تراقی

شعری اصطلاح میں تراقی سے مراد ہے کہ جس مصرعے کو بھی پہلے پڑھیں ترتیب

بدل جائے مگر معنی نہ بدلنے پائیں۔اس کی مثال کچھ یوں ملتی ہے:

دھوکے کی ردا اوڑھ کے یاروں کی طرح ہیں
کچھ لوگ حقیقت میں جو خاروں کی طرح ہیں(۴۵)

صنعتِ تعلّی

اصطلاح شاعری میں اس سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے کلام میں اپنی بڑائی کو بیان کرے اور ان اشعار میں خود کو ایک بڑا شاعر بیان کرے، یعنی شاعری میں اپنی انفرادیت کو بیان کرے تعلّی کہلاتا ہے۔اس کی مثال جمال نقوی کے کلام میں کچھ یوں نظر آتی ہے:

ہمارے شعر حقیقت کی ترجمانی ہیں
جمال سب سے جدا ہے ہمارا طرزِ بیاں(۴۶)

ii۔جمال نقوی کی نظم

اُردو میں جدید نظم کی روایت

ہر وہ چیز جدید کہلاتی ہے جو اپنے زمانے کے تقاضوں پر پورا اُترے۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ سوچ میں تبدیلی کے محرکات مختلف ہوتے ہیں اور یہ سوچ کی تبدیلی کبھی اُسے ماضی پرست بنا دیتی ہے اور کبھی قوانین و قواعد سے رُوگردانی پر مجبور کرتی ہے۔ خالق کائنات نے انسان کے اندر جستجو کا مادہ رکھا ہے۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے، جہاں تک جدید شاعری کا تعلق ہے تو عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"درحقیقت جدید شاعری وہ شاعری ہے جو کسی انقلابی انداز سے بدلتے ہوئے ماحول کی صحیح ترجمانی میں خود اپنے آپ کو بدل دے اس کے لیے

روایت سے تھوڑی سی بغاوت ضروری ہے۔ تجربے کے ہاتھ کا بھی اس میں شامل ہونا یقینی ہے جو شاعری کی روایت پر چلتی بنی بنائی ڈگر سے تھوڑا سا ہٹ کر چلتی ہے اور جس کی رفتار میں تجربہ کا آہنگ ہوتا ہے اس کو ادبی اصطلاح میں جدید کہتے ہیں۔" (۴۷)

دُنیا اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ ہر چیز میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اس ترقی یافتہ دور نے جس طرح دوسرے شعبہ ہائے زندگی پر اثر ڈالا ہے وہاں ادب پر بھی اس نے اثرات ڈالے ہیں۔ اُردو نظم بھی مختلف تجربوں سے گزری ہے اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اس میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ موضوعاتی نظم کا باقاعدہ آغاز نظیر اکبرآبادی سے ہوتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا زمانہ وہی ہے جو آتش و ناسخ کا ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے زندگی سے متعلق ہر موضوع پر نظم لکھی ہے ان کے نمائندہ موضوعات میں عشق، مذہب، موسم، تفریحات، فلسفہ حیات و مرگ اور افلاس و امارت وغیرہ شامل ہیں۔ نظیر کی شاعری کے متعلق انور سدید لکھتے ہیں:

"انھوں نے تجربے کی اجتماعی صورت کو اُبھارا اور غزل کی عمومیت کو نظم کے پیکر میں سمونے کی کوشش کی نظیر کا یہ تجربہ نادر تھا اس لیے جب اُردو نظم کو عروج حاصل ہوا تو نظیر کے فن کا ستارہ نئی آب و تاب کے ساتھ سامنے آ گیا۔" (۴۸)

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل گئے۔ جذبات کے اظہار کے لیے غزل کی نسبت نظم زیادہ موزوں تھی اور یوں نظم کی طرف لوگ متوجہ ہو گئے۔ انگریزی تعلیم کا دور دورہ تھا۔ اور اس کا اثر اُردو ادب پر بھی ہوا۔ انگریزی میں غیر مقفیٰ نظم لکھی جاتی تھیں۔ اُردو میں بھی لکھی جانے لگیں مگر یہ طرز عام نہ ہو سکی۔ شروع میں مولوی علی حیدر طباطبائی، مولانا شرر، مولانا الطاف حسین حالی اور محسن کاکوروی نے ایسی

نظمیں لکھیں۔

۱۸۶۴ء میں انجمن پنجاب قائم ہوئی۔ کرنل ہالرائیڈ اس کے سرپرست تھے اور ڈاکٹر لائبنر صدر تھے۔ محمد حسین آزاد انجمن کے روحِ رواں تھے۔ محمد حسین آزاد ادب میں تبدیلی لانے کے لیے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ اردو شاعری گل و بلبل کے قصوں سے آزاد ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے نظم کو غزل پر ترجیح دی۔

اقبال کے ہم عصر شعرا میں عظمت اللہ خاں، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک، مولانا ظفر علی خاں، سرور جہاں آبادی شامل ہیں۔ اقبال کا کلام زبان و بیان کی خوبصورتی میں یکتا و بے مثال ہے۔

جوش کی نظموں میں معاشرے کو بدلنے کا ترقی پسندانہ رویہ موجود ہے۔ وہ اپنی نظموں میں قوم کو مخاطب کرتے ہیں۔ ''غلاموں کی بغاوت''، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام'' اور نظامِ نو وغیرہ ان کی نظمیں ہیں۔ جوش کے بعد نظم گو شعرا میں اختر شیرانی، فیض احمد فیض، احسان دانش، حفیظ جالندھری، معین احسن جذبی، انجم رومانی، سلیم احمد اور حبیب جالب اہم ہیں۔ ترقی پسند تحریک ایک موثر اور پُرجوش معاشرتی تحریک تھی اس تحریک نے معاشی ناانصافی کے دور میں انسانیت اور مساوات کا درس دیا اور معاشی لحاظ سے انصاف کے لیے آواز اُٹھائی۔ اس کے بانی شعرا میں فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز اور جاں نثار اختر شامل ہیں۔

فیض احمد فیض انقلابی شاعر ہیں۔ انھوں نے مزدوروں کے حق میں آواز اُٹھائی۔ ان کی نظم ''رقیب سے'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ

اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے(۴۹)

آزاد نظم کی بانیوں میں تصدق حسین خالد، میراجی اور ن م راشد شامل ہیں۔ جدید ترین دور کا نمائندہ شاعر مجید امجد کو کہا جا سکتا ہے۔ مجید امجد نے جدید نظم کے اسلوب و بیان میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

جمال نقوی کی نظم گوئی

ہر انسان مختلف جذبات و احساسات رکھتا ہے اور اس کے اظہار کا بیان منفرد انداز میں کرتا ہے۔ خالق کائنات نے کائنات کی ہر شے کو الگ انداز میں پیدا کیا ہے۔ یہاں تک انسانوں کی شکل و عادات سے لے کر اُس کے فنگر پرنٹس تک ہر چیز انفرادیت کی حامل ہے۔ شاعر اور ادیب بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے دوسروں سے مختلف الفاظ تراکیب ایجاد کرتے ہیں۔ وہ موجودہ اشیاء میں تھوڑا بہت ردّ و بدل کر کے اُس کو نئی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح جمال نقوی کا بھی اپنا الگ انداز بیاں ہے۔ ان کی نظم گوئی کے بارے میں پروفیسر ریاض صدیقی لکھتے ہیں:

"جمال نقوی کی شاعری اُردو نظم گوئی کے اس دورِ زوال میں نظم کی از سرِ نو بازیافت کی ایک خوش آئند کوشش ہے۔"(۵۰)

جمال نقوی نے جہاں اپنی نظموں میں محبت کے رنگ نمایاں کیے ہیں وہاں زندگی کی تلخیوں کو بھی بیان کیا ہے وہ بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں اس لیے ان کی شاعری میں معاشرتی پہلوؤں کو زیادہ بہتر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ کبھی تو معاشرے کے تاریک پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی برائیوں کے چھپے ہوئے محرکات کو بے نقاب کرتے ہیں اور کبھی صاحب اقتدار لوگوں کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا:

"ترقی پسند شعراء نے اُردو نظم کے دائرے کو موضوعات اور اسالیب میں بڑی وسعت عطا کی۔" (۵۱)

شاعر معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے، جو معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح بُرائی دیکھ کر آنکھیں بند نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے پس پردہ حقائق کو جاننے کی پوری کوشش کرتا ہے۔

جمال نقوی نے اپنی نظموں کے زیادہ تر موضوعات زندگی کے تلخ حقائق کو بنایا ہے اور انھیں بے نقاب کر کے لوگوں کو سوچنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ذیل میں ہم جمال نقوی کی نظم کے موضوعات کا جائزہ لیں گے۔

عشق و محبت

انسان کا تعلق خواہ دُنیا کے کسی خطے سے بھی ہو اور وہ جس نسل سے بھی تعلق رکھتا ہو۔ اس کے اندر محبت کے جذبات ضرور ہوتے ہیں اور انسان زندگی میں عشق و محبت کی منزلوں سے ضرور گزرتا ہے۔ ہر انسان کو اس راہ میں مسائل پیش آتے ہیں۔ اور ان مسائل کا انحصار جذبے کی صداقت پر ہوتا ہے۔ ایک عام انسان کی نسبت شعرا عشق و محبت کے احساسات اور تکالیف کو ایک نئے رنگ اور ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔

جمال نقوی کی ایک نظم اس سلسلے میں ملاحظہ ہو:

"قربتیں اتنی
کہ اِک جان ہے
دو قالب ہیں
دوریاں اتنی کہ

جیسے ہوں فلک اور زمیں
سامنے رہ کے بھی
دونوں کبھی مل سکتے نہیں" (۵۲)

سیاست

سیاست کسی ملک میں اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور سیاست دان ملک کی باگ دوڑ سنجالتے ہیں۔ اس دور میں سیاست ایک پیشہ بن کر رہ گئی ہے۔ سیاست نے منافقت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔

موجودہ تناظر میں سیاست محض اپنے مخالفین کے خلاف بیانات دینے تک محدود ہوگئی ہے۔ لوگ اپنی انا کی تسکین کے لیے دوسروں کی ذات پر کیچڑ اچھالتے نظر آتے ہیں، جو لوگ اقتدار کی کرسی سنجالتے ہیں وہ آتے ہی اپنے مخالفین کے خلاف بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ ان سے پہلے جو لوگ تھے وہ منافق اور دھوکے باز تھے لیکن ہم عوام کی اُمیدوں پر پورا اُتریں گے، مگر ایسا ہوتا نہیں۔

جمال نقوی نے اس تناظر میں نظم "فصل" تحریر کی ہے:

"ہر آنے والا کہتا ہے
جو چلے گئے
وہ دشمن تھے
وہ چور، لٹیرے، رہزن تھے
سب لے گئے لوٹ کے مال و متاع
جو کچھ اچھا تھا چھانٹ کے وہ
باقی اک بنجر دھرتی ہے جس پر اب آگ برستی ہے
سب موسم پیار محبت کے کسی بادِ خزاں نے لوٹ لیے

اب اگلی رُت کیسی ہوگی

اور اگلی فصل کا کیا ہوگا" (۵۳)

منافقت

ایک بڑی معاشرتی برائی ہے جس میں اس صدی کا انسان مکمل طور پر گرفتار نظر آتا ہے اور زمانے میں اپنی ساکھ بہتر بنانے اور معاشرے میں اعلیٰ معیار زندگی حاصل کرنے کے لیے دوہری زندگی گزار رہا ہے وہ معاشرے میں موجود افراد کو تو دھوکا دے ہی رہا ہے وہ اپنی ذات کے ساتھ بھی دھوکہ دہی کا مرتکب نظر آتا ہے۔ منافقت نے معاشرہ کی اقدار کو بُری طرح سے مجروح کیا ہے اور انسانوں کا انسانوں پہ سے اعتبار اُٹھ گیا ہے اور معاسرہ انتشار کا شکار ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں جمال نقوی لکھتے ہیں:

"لباس صاف ہے

چہرہ دُھلا ہے

بال درست

مگر دلوں میں کدورت ہے

ذہن گندہ ہے

ہنوز آدمی اِک جھوٹے خول میں ہے بند" (۵۴)

وہ کہتے ہیں کہ اس منافقت کا شکار صرف عام انسان ہی نہیں ہیں بلکہ جن لوگوں کا رشتہ قلم کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ وہ لوگ بھی منافقت سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ضمیر ہار گیا

اور اس طرح میں نے

زمانے والوں سے سمجھوتہ کرلیا آخر" (۵۵)

دوسری جگہ انھوں نے قلم کے عنوان سے نظم لکھی ہے:

"قلم نے
جب جھکائی
صاف کاغذ پر جبیں اپنی
تو پھر
اک لفظ بسم اللہ کے آگے نہیں لکھا
وہ یوں گویا ہوا
میں کب تک سہتا رہوں یہ غم
کہ تو ہر دم
خدا کے نام سے ہی ابتدا کرتا ہے
اور پھر جھوٹ لکھتا ہے
یہ ظلم و جور کی تحریر
میں کب تک لکھے جاؤں
تیرے ہاتھوں غم و آلام
میں کب تک سہے جاؤں" (۵۶)

ان کی یہ نظم ان کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو قلم کی عظمت کو بیچ دیتے ہیں۔

معاشرتی مسائل

جمال نقوی کی معاشرے پر گہری نظر ہے اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ

سے ان کی شاعری میں زندگی کے تمام مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ معاشرے میں موجود افراد کے مسائل کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ موجودہ حالات میں انسان مختلف مسائل کا شکار ہے اور زندگی کا دائرہ روز بروز اس پر تنگ ہو جارہا ہے۔ ایک مخصوص طبقے کے علاوہ سارا معاشرہ ان معاشی اور معاشرتی حالات میں پس رہا ہے۔ اس تناظر میں ان کی نظم "نیا امرت" دیکھیے:

"زہر پیتے ہوئے بیمار سے پوچھا میں نے
بھائی!
کیا بات ہے
کیا موت سے ملتی ہے شفا؟
اس نے حیرت سے کہا
آپ کو معلوم نہیں؟
اب تو جینے کے لیے زہر پیا جاتا ہے" (۵۷)

اس نظم میں انھوں نے پورے منظرنامے کو بیان کیا ہے اور نظم میں خوبصورتی اور اثر پیدا کرنے کے لیے مکالماتی رنگ کو اختیار کیا ہے اور نظم میں ڈرامائی کیفیت کو پیدا کیا ہے جس سے نظم کا تاثر گہرا ہو گیا ہے۔

بغاوت

انقلابی سوچ کے حامل ماحول سے بغاوت کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ حالات کے بغاوت کرنے والے انقلابی سوچ کی وجہ سے منفرد مقام حاصل کرتے ہیں۔ باغی حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتا بلکہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے، چاہیے وہ اس کی استطاعت نہ بھی رکھتا ہو اور یوں خود کو منافق بننے سے بچالیتا ہے۔ سچا شاعر معاشرے کی اصلاح و ترقی میں

اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن معاشرے میں موجود کالی بھیڑوں کے لیے سچا انسان زہر قاتل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جمال اپنی کتاب "خوشبو گلابوں کی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"سچا ہونا شاعری کرنا اور اختلاف کرنا ہمارے معاشرے کی تین خرابیاں ہیں اور میں ان کا مجموعہ ہوں، کیوں کہ سچ کہنا اور اختلاف کرنا اپنی عادت ہے میری نظموں میں آپ کو ان تمام کا عکس نظر آئے گا۔" (۵۸)

ہر دور میں سچ بولنے والے کو تختہ دار پر چڑھایا گیا لیکن سچ بولنے والے کا پیغام دُنیا کے ہر خطے میں پہنچ گیا۔ اس سلسلے میں جمال نقوی کی نظم "خونِ ناحق" ملاحظہ ہو:

"جو کربلا میں بہا
اور اب بھی بہتا ہے
تمام حق و صداقت کے جاں نثاروں کا
خلوص و امن و محبت کے شہسواروں کا
یہی وہ خون ہے
تاریخ جو بناتا ہے
تمام ذہنوں کو پیغام یہ سناتا ہے
کہ جس زمین پہ ٹپکے گا
خونِ ناحق یہ
وہاں سماج میں
اک انقلاب آئے گا
مٹے گی ظلمتِ شب
چاہے تھوڑی دیر لگے

طلوعِ مہر سے

عالم یہ جگمگائے گا" (۵۹)

حاکمِ وقت کے خلاف آواز بلند کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، مگر پھر بھی سقراط سے حضرت امام حسینؑ تک اور حضرت امام حسنؑ سے اب تک کلمۂ حق کہنے کی روایت چلی آ رہی ہے۔

اُمید

جمال نقوی ایک روشن خیال شاعر ہیں جو کہ اُمید رکھتے ہیں کہ ظلمت کی ان اندھیری راتوں کے بعد ایک روشن سویرا ہوگا اور اس کے لیے ہمیں محنت کی ضرورت ہے اور حالات چاہے جیسے بھی ہوں اُمید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جمال نقوی کی ہائیکو کے بارے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی رقم طراز ہیں کہ:

"جمال نقوی کی ہائیکو کے لہجے میں اعتماد اور اثر کا سرچشمہ لہریں لیتا ہوا صاف دکھائی دیتا ہے۔ فنکاری کے اِمکانات کا شعور پایا جاتا ہے اور عصری تقاضوں سے بھرپور آگاہی ملتی ہے۔" (۶۰)

جمال نقوی کے خیال میں انسان کو اُمید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے اور کوشش و محنت کے ساتھ وقت کو بدلنے کی قوت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کب تک یہ ظلمات

سورج اور دن نکلیں گے

بدلیں گے حالات" (۶۱)

اور حالات کو بدلنے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس تناظر میں قائد کے افکار کو یوں بیان کیا ہے:

"قائد کا پیغام
ملک کی خاطر کرنا ہے
کام ہی کام اور کام" (۶۲)

اور وہ خود محنت کا پیغام یوں دیتے ہیں:

"کھولیں ہر در بند
محنت کرلیں گر ہم ہیں
ترقی پسند" (۶۳)

حوالہ جات

۱۔ نورالحسن، نیر،مولوی، نوراللغات (جلد سوم)، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء،ص ۵۸۴

۲۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر،محمد سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر،منتخب ادبی اصطلاحات، لاہور: شعبہ تصنیف و ترجمہ،جی سی یونیورسٹی،۲۰۰۵ء،ص ۲۱۸

۳۔ فہمیدہ ریاض، سہ ماہی خیال، کراچی: جنوری تا مارچ،۲۰۰۸ء،ص

۴۔ فضل الٰہی عارف، مرتبہ: فرہنگ کارواں، لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۶۲ء،ص ۵۰۸

۵۔ جمال نقوی، ڈاکٹر، جمال وکمال، کراچی: خیال پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء،ص

۶۔ جمال نقوی، ڈاکٹر، مزاج سخن، کراچی: ارتقا بک کلب، ۲۰۰۳ء،ص ۳۵

۷۔ ایضاً،ص ۱۹

۸۔ ایضاً،ص ۱۹

۹۔ عالیہ امام، ڈاکٹر، سہ ماہی خیال، کراچی: جنوری تا مارچ،۲۰۰۸ء،ص ۱۷۹

۱۰۔ خیال امروہوی، ڈاکٹر، سہ ماہی خیال، کراچی: جنوری تا مارچ،۲۰۰۸ء،ص ۱۷۹

۱۱۔ مزاج سخن،ص ۴۴

۱۲۔ ایضاً،ص ۴۴

۱۳۔ سہ ماہی خیال، کراچی: جنوری تا مارچ،۲۰۰۸ء،ص ۸۷

۱۴۔ جمال نقوی، ڈاکٹر، مزاج سخن، کراچی: ارتقا بک کلب، ۲۰۰۳ء،ص ۴۴

۱۵۔ ایضاً،ص ۳۸

۱۶۔ ایضاً،ص ۳۸

۱۷۔ ایضاً، سہ ماہی خیال، کراچی: جنوری تا مارچ،۲۰۰۸ء،ص ۱۹۴

۱۸۔ ایضاً،ص ۳۸

۱۹۔ ایضاً،ص ۷۷
۲۰۔ ایضاً،ص ۱۱۰
۲۱۔ مزاجِ سخن،ص ۲۳
۲۲۔ ایضاً،ص ۲۳
۲۳۔ سہ ماہی خیال، کراچی،ص ۱۹۰
۲۴۔ ایضاً،ص ۱۹۱
۲۵۔ ایضاً،ص ۱۹۱
۲۶۔ ایضاً،ص ۱۹۱
۲۷۔ مزاجِ سخن،ص ۱۵۷
۲۸۔ ایضاً،ص ۲۳۰
۲۹۔ ایضاً،ص ۱۳۸
۳۰۔ ایضاً،ص ۱۵۷
۳۱۔ ایضاً،ص ۲۲۹
۳۲۔ ایضاً،ص ۱۰۵
۳۳۔ ایضاً،ص ۹۳
۳۴۔ ایضاً،ص ۲۲۷
۳۵۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر محمد سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، منتخب ادبی اصطلاحات،ص ۴۲۶
۳۶۔ جمال و کمال،ص ۱۹۳
۳۷۔ ایضاً
۳۸۔ ایضاً،ص ۱۹۶
۳۹۔ ایضاً،ص ۱۹۳
۴۰۔ ایضاً،ص ۱۹۳
۴۱۔ ایضاً،ص ۱۹۶
۴۲۔ ایضاً،ص ۱۹۷
۴۳۔ ایضاً،ص ۱۹۹

۴۴۔ ایضاً،ص ۱۹۹

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ ایضاً،ص ۱۹۴

۴۷۔ ایضاً،ص ۱۹۵

۴۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، کراچی: اُردو دنیا، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱

۴۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: اے ایچ پبلشرز، ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۹

۵۰۔ ریاض صدیقی، پروفیسر، سہ ماہی خیال، کراچی: جنوری تا مارچ، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۰

۵۱۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اُردو نظم انتخاب پذیری، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶

۵۲۔ ایضاً،ص ۳۰

۵۳۔ ایضاً،ص ۱۰۸

۵۴۔ ایضاً،ص ۲۰

۵۵۔ ایضاً،ص ۲۰

۵۶۔ ایضاً،ص ۸۹

۵۷۔ ایضاً،ص ۳۹

۵۸۔ ایضاً،ص ۱۸۲

۵۹۔ ایضاً،ص ۱۶۶

۶۰۔ ایضاً،ص ۱۳۷

۶۱۔ جمال نقوی، ڈاکٹر، ننھے سورج دیس کے، کراچی: ادارہ تزئینِ دانش، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۵

۶۲۔ ایضاً،ص ۱۳۹

۶۳۔ ایضاً،ص ۱۴۷

باب سوم
ڈاکٹر جمال نقوی اور ترقی پسند فکر

ترقی پسند تحریک پس منظری مطالعہ

انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی برصغیر میں سائنس کے فروغ اور صنعتی دور کا آغاز ہوا، جس نے سماج میں بہت سی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ سائنس اور اس کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو کشادہ دلی سے قبول کرنے کا نام ہی خرد افروزی ہے۔ روشن خیالی اور ترقی پسندی اس حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ دو متحرک طاقتوں کے اتصال یا ان کے درمیان کشمکش کے نتیجے میں ایک تیسری صورت کا ظہور لازم ہے۔ یہی مارکسی جدلیت کا تصور ہے۔

جدید اُردو ادب میں مرزا غالب کو روشن خیالی کی تحریک کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ ان کے بعد سرسید نے جدید فکری تبدیلیوں کو غالب کی سطح سے آگے جا کر دیکھا۔ سرسید تحریک کے نتیجے میں برصغیر کے مسلم حلقوں اور اُردو ادب میں روشن خیالی کی فضا کو فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک سرسید تحریک کی ایک توسیعی شکل کہی جا سکتی ہے، جس نے ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد روشن خیالی اور ترقی پسندی کی روایت کو عروج پر پہنچایا۔ اس سے قبل جولائی ۱۹۳۵ء میں دُنیا کے روشن خیال ادیبوں نے پیرس میں ایک عالمی کانفرنس بلائی۔ اس موقع پر ادیبوں کے نام جو اپیل شائع کی گئی اس میں تمام قلم کاروں سے گزارش کی گئی تھی۔

"رفیقانِ قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کیجیے۔ ہمارا قلم، ہمارا فن، ہمارا علم ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں جو

انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں جو روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں، جو کارخانہ داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف رُوپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔"(۱)

یہ وہ موقع تھا جب ساری دُنیا کے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہو گئے تھے۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سارے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادئ خیال ورائے کے تحفظ کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہی ایک راستہ ہے جس کے ذریعے ادیب اپنے حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ اس کانفرنس کے ہو جانے کے بعد ساری دُنیا کی ترقی پسند ادبی تحریکوں کا ایک بین الاقوامی مرکز پیرس میں قائم ہو گیا اور دُنیا کی مختلف قوموں میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریک اب تنظیمی طور سے ایک رشتے میں منسلک ہو گئی۔ اس تحریک میں مندرجہ ذیل عوامل پر روشنی ڈالی گئی۔

"اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت یقینی اور لازمی ہے۔ اپنی زندگی کی مُدت بڑھانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ادب جدید قسم کی ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رُجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو اِن رجعت پسند طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اِسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا مؤثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اور ہم

چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔" (۲)

یہ اندازِ فکر ہندوستان اور اس کے ادیبوں کے لیے قطعی نئی چیز تھا۔ اس سے قبل نہ تو ادب کسی تحریک یا اس کے مقاصد کا ہمنوا ہو انہ تخلیق کو منشور کے تابع کرنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ نہ ہی قلم کو ہتھیار قرار دے کر ادیبوں کو پرچم تلے جمع ہونے کی تلقین کی گئی۔ ترقی پسند تحریک ادب کی سب سے نزاعی اور توانا تحریک تھی۔ دراصل اپنے عصر کی طرح یہ تحریک بھی ذہنی سطح پر احتجاج کا ایک انداز ہی تھی۔ اس وقت تک کا ہندوستان پہلی جنگِ عظیم میں انگریز راج کے لیے خون بہانے کے بعد آنے والی جنگِ عظیم سے قبل کی کساد بازاری، معاشی بدحالی اور سیاسی خلفشار کے دور سے گزر رہا تھا۔ مسلم لیگ نے ابھی قراردادِ پاکستان منظور نہ کی تھی۔ ملک گیر پیمانہ پر پھیلی بے چینی نے جب زندگی کے اور شعبوں کی طرح گدلے پانی جیسے ادب میں بھی لہریں پیدا کیں تو نتیجہ ترقی پسند ادب کی صورت میں ظاہر ہوا۔

"World congress of the wirters for the defence of culture." کے نام سے ادب اور تہذیب کی حفاظت کے لیے گورکی، رومین رولاں، طاس مان، ہنری باربوس، ورلڈ فریک اور آندرے مالرو کی رہنمائی میں جولائی ۱۹۳۵ء میں ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی جس میں ساری دُنیا کے بڑے بڑے ادیب شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کا کوئی بڑا ادیب شریک نہیں ہو سکا لیکن سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے جو اس زمانہ میں لندن میں تھے، اس میں شرکت کی۔ اس زمانہ میں ٹیگور نے اپنی آواز فاشزم کی مخالفت میں بلند کی۔ پیرس کانفرنس کے انعقاد سے چھ ماہ پہلے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے

لندن میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کی مدد سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کے خیال کو عملی جامہ پہنچایا۔ ۱۹۳۵ء میں لندن کے نانکنگ ریستوران میں ان کا پہلا اعلان نامہ تیار کیا گیا جس پر ہندوستان کے بڑے بڑے، محترم ادیبوں نے بعد میں دستخط کیے اور پھر اسی اعلان نامہ کی بنیاد پر ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو انجمن کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منشی پریم چند کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ ترقی پسند تحریک بڑی تیزی سے پھیلنے لگی اور اُردو کے تقریباً تمام بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اس کا خیر مقدم کیا جن میں سب سے اہم پریم چند، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی اور ساغر نظامی کے نام ہیں۔ اقبال نے بھی سجاد ظہیر کی حوصلہ افزائی کی۔ ''روشنائی'' میں سجاد ظہیر نے علامہ اقبال سے ملاقات کا مفصل اور دلچسپ احوال قلمبند کرتے ہوئے علامہ کی جانب سے یہ جملہ بھی لکھا ہے: ''میرا نقطۂ نظر آپ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیں۔''

دسمبر ۱۹۳۲ء میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' طبع ہوا، اور چار ماہ بعد ضبط کر لیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں احمد علی کے افسانوں کا مجموعہ ''شعلے'' چھپا۔ احمد علی نے اپنے ایک مضمون ''تحریک ترقی پسند مصنفین اور تخلیقی منصب'' میں اس تحریک کی داستان کو یوں بیان کیا ہے:

''محمود الظفر نے میرے اور رشید جہاں کے مشورے سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ سجاد ظہیر اس وقت لندن میں تھے۔ ان کی رضامندی کا ذمہ لیا جو بعد میں انھوں نے خود بھی بذریعہ خط بھیج

دی۔ چنانچہ ۳۳۔۱۹۳۲ء میں اس کے باقی بانیوں کے سامنے جو اصل مقصد تھا، وہ بالکل ادبی تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ ہم ان تمام مسائلِ زندگی پر آزادیٔ رائے اور تنقیدی حق چاہتے ہیں جو نسلِ انسانی کو بالعموم اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص درپیش ہیں۔ اسی زمانہ میں لیکن اس اعلان کے بعد برصغیر کے ادیبوں کا ایک جلسہ لندن میں بھی منعقد ہوا جس میں ملک راج آنند، راجہ راؤ، سجاد ظہیر کے علاوہ دیگر حضرات بھی شامل تھے جنھوں نے ہمارے مقصد سے ملتے جلتے خیالات سے اتفاق کیا۔" (۳)

ترقی پسند تحریک کی ابتداء اگرچہ نا مساعد حالات میں ہوئی تھی۔ تاہم ہندوستان میں اس تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے فضا موجود تھی۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک کو پہلے دور میں ہی فعال حیثیت حاصل ہوگئی اور اس نے ملک کی عام ادبی فضا میں تحرک اور ردِ عمل پیدا کیا۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کل کانفرنس ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ اس کانفرنس میں پڑھی جانے والی سب سے اہم چیز منشی پریم چند کا خطبۂ صدارت تھا، جس میں انھوں نے ادب کی دائمی قدروں کو اجاگر کیا اور حسن، صداقت، آزادی اور انسان دوستی کو اعلیٰ ادب کا جزولاینفک قرار دیا۔ منشی پریم چند نے کہا:

"جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لیے بے کار ہے اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔۔۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے تخریب نہیں۔۔۔ ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے۔۔۔ اس کی

بدولت نفس کی تہذیب ہے یہ اس کا مقصدِ اولیٰ ہے۔" (۴)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زندگی" اکتوبر ۱۹۳۴ء میں "ہندی" میں اور جولائی ۱۹۳۵ء میں اُردو میں شائع ہوا تو اس نے نوجوان ادبا کی متذکرہ بغاوت کا ناطہ زندگی سے جوڑ دیا اور یوں وہ اساس دستیاب ہوگئی جس پر بعد میں ترقی پسند تحریک نے اپنا سفر جاری کیا۔

ڈاکٹر اختر حسین نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ:

اوّل

صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ اس کے لیے دل میں خدمتِ خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے۔

دوم

ہر ایماندار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی بیگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے۔

سوم

ادیب کو رنگ و نسل اور قومیت اور وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت اور مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چوبچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے مندرجہ بالا موقف میں رُوسی مصنفین طالسطائی اور گورکی کے تنقیدی خیالات کی بازگشت واضح سنائی دیتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو ادب میں یہ آواز پہلے پیدا نہیں ہوئی تھی اور اختر حسین رائے پوری نے رُوسی تنقید کے مندرجہ بالا نظریات کو فروغ دینے کی کوشش کی تو اسے استدلال کی گہرائی سے

ثابت بھی کیا چنانچہ انھوں نے ماحول کے نئے تقاضوں کے مطابق ادیب کی آزادی کا حق طلب کیا۔ ادب اور زندگی کے مقاصد کا تعین کیا اور ادب کو زندگی اور ماحول کا ترجمان قرار دیا۔ بادی النظر میں یہ خیالات وہی ہیں جن کا عملی اظہار 'انگارے' اور 'شعلے' کے افسانوں اور احمد علی کے بیان مطبوعہ 'لیڈر' میں کیا گیا ہے۔ تاہم اختر حسین رائے پوری کو ترقی پسند تحریک کے اولین مشعل برداروں میں شامل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ انھوں نے اس تحریک کی تنقیدی جہت تلاش کی اور عوامی بہبود کو ادب کا ایک اہم مقصد قرار دے کر اسے زندگی اور ماحول کی ترجمانی پر مامور کر دیا۔

ترقی پسند تحریک مجموعی طور پر اس اضمحلال، مایوسی اور قنوطیت کا ردِ عمل تھی جسے بیسویں صدی کے ربع سوم نے اچانک اُبھار دیا تھا۔ یورپ میں اسی زمانے میں فسطائی طاقتوں کو عروج حاصل ہوا تو دُنیا میں انسانیت کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ ادب میں 'حقیقت نگاری' کی تحریک رُومانیت پر غالب آ رہی تھی۔ انگریزی علوم کے فروغ نے سائنسی شعور کو کروٹ دے دی، چنانچہ جاگیرداری نظام آہستہ آہستہ رُو بہ زوال ہونا شروع ہو گیا۔ اس قسم کا ماحول ترقی پسند تحریکوں کے فروغ میں ہمیشہ معاون ہوتا ہے۔

سجاد ظہیر اگر اس تحریک کی باقاعدہ تنظیم نہ بھی کرتے تو پریم چند کی حقیقت نگاری اور رُوسی نظریات کا فروغ کسی ایسی تحریک کے فروغ پر یقیناً منتج ہوتا جو لکھے ہوئے منشور کے بغیر ہی ادب کو نئی ڈگر پر ڈال دیتا۔

ترقی پسند تحریک بنیادی طور پر ادبی تحریک تھی لیکن اس کے معاونین میں بہت سے ایسے ادباء بھی شامل تھے جن کے سیاسی نظریات ان کی زندگی کے پورے کُل پر محیط تھے چنانچہ ان لوگوں نے جب ایک ادبی تحریک کی قیادت سنبھالی تو ادب کو سیاست میں استعمال کرنے کی کوشش کی اور ذہنی پیش قدمی کو تیز تر کر دیا۔

"ترقی پسند اُردو نثر کے پچاس سال پاکستانی معاشرے کے تناظر میں"

مختصر جائزہ

"ترقی پسند اُردو نثر کے پچاس سال پاکستانی معاشرے کے تناظر میں" ڈاکٹر جمال نقوی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے مقتدرہ قومی زبان نے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ تحقیقی مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ پس منظر، یعنی قیامِ پاکستان سے قبل ترقی پسند اُردو نثر کی صورت حال کے بارے میں ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب

روشن خیالی، برصغیر کے سماج میں اس کے اثرات اور ارتقاء کے بارے میں ہے۔ اس باب میں روشن خیالی کی تشریح کی گئی ہے۔ اُردو نثر کی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور اسے ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتداء قرار دیا گیا ہے۔ غالب، سرسید، حالی، نیاز فتح پوری اور علامہ اقبال اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

دوسرا باب

اُردو ادب میں سماجی حقیقت نگاری اور روشن خیالی کے رُجحانات کے بارے میں ہے، جس کی روایت غالب، سرسید اور حالی کے توسط سے عہد حاضر تک پہنچی ہے۔ بعد میں آنے والوں میں حسرت موہانی، پریم چند اور اقبال کی تخلیقات میں بھی انھی افکار و تصورات کی جلوہ افروزی نظر آتی ہے، مگر یہ سب کچھ ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتداء سے پہلے کی باتیں

ہیں۔

تیسرا باب

تیسرا باب ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک ترقی پسند ادبی تحریک کے اجمالی جائزے پر مشتمل ہے۔ غیر متحرک ادبی سمندر میں پہلا پتھر ۱۹۳۲ء میں "انگارے" کے ذریعے پھینکا گیا تھا اور پھر ۱۹۳۵ء میں لندن اور ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل ہوئی اور یوں تحریک کا آغاز ہوا۔

مقالے کا دوسرا حصہ پیش منظر یعنی قیامِ پاکستان اور اس کے بعد ترقی پسند اُردو نثر کے پچاس سالہ دور کا اجمالی تجزیہ ہے۔ یہ حصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

چوتھا باب

چوتھا حصہ پاکستانی معاشرے سے متعلق ہے۔ آزادی کے بعد جس کا وجود جمہوریت اور آمریت کے ساتھ ساتھ آج تک جاری ہے۔ اس مخصوص معاشرے اور سماج کی عکاسی کو ترقی پسند اُردو ادب نے فروغ دیا۔ اسی پاکستانی معاشرے کے تناظر میں ترقی پسند اُردو نثر کے کردار کا جائزہ آئندہ کے ابواب میں لیا گیا ہے۔

پانچواں باب

پانچواں باب قیامِ پاکستان کے بعد تخلیق کی جانے والی اُردو نثر کے تجزیے پر مبنی ہے جس کو چار اہم حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی تنقید، فکشن، خودنوشت اور رپورتاژ۔ ان چاروں شعبوں میں ماضی اور حال کے بزرگ پاکستانی ترقی پسند منتخب قلم کاروں کے فن اور

ان کی تخلیقات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چھٹا باب

اُردو دُنیا کے اہم ترقی پسند صاحبانِ قلم سے گفتگو پر مبنی ہے یہ گفتگو رُوبرو بھی ہوتی ہے اور تحریری طور پر سوالنامے کے جوابات کے ذریعہ بھی کی گئی ہے۔ ترقی پسند قلم کاروں نے اپنی آراء پیش کی ہیں۔

ساتواں باب

ساتواں باب ترقی پسند رُجحانات و میلانات کے تنقیدی محاکمے پر مشتمل ہے، جس میں ترقی پسند اہلِ قلم کی گفتگو اور تحریروں سے ان رُجحانات و میلانات کے مثبت اور منفی نتائج کی نشاندہی ہوئی ہے اور اس کے نتیجے میں قومی اور سیاسی بیداری کی اِبتداء اور خرد افروزی و روشن خیالی کا آغاز ہوا۔ تخلیقی اور نظریاتی سوچ کو فروغ ملا۔ حقیقت نگاری نے سماجی رنگ اپنایا اور نت نئے تجربات ہونے لگے، جس سے اُردو ادب کو جلا ملی، مگر دوسری طرف کچھ کوتاہیوں کی وجہ سے تخلیقی سطح پر نقصانات بھی ہوئے۔ تمام تر پابندیوں کے باوجود ترقی پسند ادبی تحریک کے اِس کارواں کا جدلیاتی سفر جاری ہے اور جاری رہے گا۔

آٹھواں باب

آٹھواں باب اختتامیہ پر مشتمل ہے جس میں مذکورہ بالا تمام ابواب میں کی گئی گفتگو اور تجزیے کی روشنی میں ایک مجموعی تاثر اور نتیجہ پیش کیا گیا ہے۔

روشن خیالی: برصغیر کے سماج میں اس کے اثرات اور ارتقاء

سترھویں صدی کی سائنسی ایجادات نے یورپ کے قدیم جاگیرداری نظام کو منہدم کر کے معاشرے کا سماجی ڈھانچہ تبدیل کر دیا۔ نئی روایات واقدار کی ابتداء ہوئی تو ذہنوں میں معاشرہ، سماج اور نظریات کے متعلق سوالات جنم لینے لگے۔ ان سوالات کے جوابات دانشوروں کی طرف سے بلاخوف دیے گئے کیونکہ اب معاشرہ آزاد تھا۔ کتب خانوں کے قیام نے روشن خیالی کی اس تحریک کو فروغ دیا۔ اس کے بارے میں یوں تحریر کیا گیا:

"روشن خیالی کی تحریک کی سب سے بڑی خصوصیت سیکولر نظریات کا فروغ ہے۔ روشن خیال تحریک کے دانشوروں نے اظہار رائے اور عمل کی آزادی پر زور دیا اور عقلیت کو تمام نظریات کے جانچنے کا معیار بتایا۔ انھوں نے ریاست اور اس کے اداروں پر تنقید کی اور اس پر زور دیا کہ یہ تنقید ہوتی رہنی چاہیے کیونکہ اگر اقتدار چند ہاتھوں میں محدود ہو گیا تو اس سے بدعنوانی پیدا ہو گی اور اکثریت اپنے حقوق سے محروم رہے گی۔" (۵)

ڈاکٹر جمال نقوی روشن خیالی کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

"سائنس اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو کشادہ دلی سے قبول کرنے کا نام ہی روشن خیالی، حریتِ فکر، خرد افروزی یا عقلیت پسندی ہے۔" (۶)

برصغیر میں سائنس کے فروغ کے ساتھ ہی سماج میں صنعتی دور کا آغاز ہوا، جس نے بہت سی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ یہ تبدیلیاں سماج کے مختلف شعبوں پر اثر انداز ہوئیں۔ اب تاریخ، سماجیات، معاشیات اور ادبیات سب ہی کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔

انیسویں صدی میں مذہبی قدامت پرستی کے خلاف روشن خیالی کی تحریک نے تجدد

پرستی کا تصور پیش کیا۔ یعنی پرانی قدروں سے گریز اور نئی قدروں کی جستجو۔ اس بارے میں تحقیق نگاروں کا یہ کہنا ہے:

"تاریخ ۔۔۔ انیسویں صدی کو روشن خیالی کے ایک ایسے عہد کا نام دیتی ہے جس میں صدیوں پرانے اوہام کی شکست ہوئی اور عقائد و توہمات کا ابتذال ہوا۔" (۷)

جدید اُردو ادب میں مرزا غالب کو خرد افروزی کی تحریک کی بنیاد سمجھا جاتا ہے کیوں کہ انھوں نے اُردو شاعری کی اس روایت کو جس میں عشق کو عقل پر فوقیت دی جاتی رہی ہے بالکل تبدیل کر دیا تھا۔ غالب کی نظر ایک فلسفی کی نظر ہے اور وہ جن چیزوں کو سامنے لاتا ہے۔ تخیل، جذبے اور تجربات کے ذریعے ان کو دائمی حقیقت اور گہرائی تک پہنچا دیتا ہے۔ ان کی شعری و نثری تحریروں میں وہ تمام فلسفیانہ خیالات موجود ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی کے یہاں ملتے ہیں۔ غالب کا فلسفۂ حیات عمل حرکت اور حرارت پر مبنی ہے۔ سرسید نے جدید فکری تبدیلیوں کو غالب کی سطح سے آگے جا کر دیکھا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی تہذیبی فکر کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے پر زور دینا شروع کیا اور اس مقصد کے لیے محمڈن سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس تحریک کی بنیاد روشن خیالی اور خرد افروزی پر قائم ہوئی تھی، جسے سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سرسید تحریک میں شامل مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد نے روشن خیالی کی اس تحریک کو آگے بڑھایا اس کے علاوہ بقول علی سردار جعفری، نیاز فتح پوری نے عقل پسندی کے کتب میں ایک پوری نوجوان نسل کی تربیت کی ہے۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے اسی تسلسل میں تاریخ اور فلسفے کی دولت سے ادب کو نوازا۔ علامہ کی تحریروں کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ فلسفہ، سائنس اور دوسرے علوم سے ان کی مراد عقل و خرد ہے۔ اس سے زندگی کی راہیں سنورتی ہیں۔ عقل و خرد کی نکتہ آفرینیوں کے

سبب معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ، منطق اور علم الکلام نے ترقی کے مدارج طے کیے اور انسان کے ظاہری انوار کو سنوارنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ عقل انسان کے شعور کی پیداوار ہے لیکن جوش و حرکت زندگی ہے۔ علامہ انکشاف حقیقت اور تعمیر خودی کے لیے عقل اور عشق کی آویزش کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اُردو ادب میں سماجی حقیقت نگاری اور روشن خیالی کے رُجحانات

اُردو ادب میں حقیقت نگاری اور روشن خیالی کی اِبتداء بادی النظر میں سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک سے ہوتی ہے۔ اسی تحریک نے موضوعات کو وسعت بخشی، بیان کی سلاست اور سادگی پر زور دیا اور اسالیب کو ایک تعمیری اور بامقصد ادب کی تخلیق کا ذریعہ بنا دیا۔ اس ادب کی بنیاد عقلیت اور حقیقت پسندی پر تھی۔ اس کا انداز جذباتی ہونے کی بجائے معروضی تھا۔

حقیقتاً اس حقیقت نگاری اور روشن خیالی کا سہرا مرزا غالب کے سر بندھتا ہے۔ ہمارے قلم کاروں کو تغیر کا احساس ہو چکا تھا۔ اور انھیں نئی راہوں کی تلاش تھی تا کہ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا ہو سکے۔ اس بات کو تقویت اختر حسین رائے پوری اور "گرد راہ" کے عنوان سے تحریر کردہ ایک مضمون سے بھی ملتی ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

> "یوں تو ترقی پسندی ہر زمانے اور ہر دور میں رہی ہے۔ لیکن عہد جدید میں ترقی پسندی کی روایت غالب سرسید اور حالی کے توسط سے چلی آ رہی ہے۔" (۸)

جب طرزِ فکر نے نئے راستے اختیار کئے تو ادب کے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے اور غالب کی ندرتِ خیال نے اس میں پہل کی۔ سرسید اور ان کے رُفقاء نے مرزا غالب کے طرزِ نگارش کو اپنایا اور حقیقت نگاری و روشن خیالی سے ادب کو مالا مال کیا۔ یہ تمام حضرات

سماج کے نبض شناس تھے اور اس کی رفتار سے واقف تھے۔ اسی بات کو عہد جدید کے ایک اہم تنقید نگار نے اپنے مضمون میں یوں تحریر کیا ہے:

''سرسید کے یہاں عقل، فکر اور علم کی حیثیت پر اس قدر زور دیا ہے کہ صرف اسی بنیاد پر وہ مدت تک ہمارے سماج کے بہت سے حلقوں اور حصوں میں ترقی پسندی کے ماڈل رہیں گے۔''(۹)

ادب ابھی ترقی پسندی کی اصطلاح سے پوری طرح روشناس بھی نہیں ہو پایا تھا۔ اس وقت بھی سرسید اور ان کے رفقاء آئندہ کی اس تحریک کے ہراول دستے کا کام کر رہے تھے۔ اُردو ادب کی تاریخ اس بارے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''سماجی اصلاح کرنے اور ہندوستانیوں کو مایوسی کے جہنم سے زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونے پر آمادہ کرنے، اپنی زبان و ادب کو سربلند بنانے سنجیدہ علمی اور عملی کاموں کی طرف متوجہ کرنے میں علی گڑھ تحریک نے ہندوستانیوں کے عام دور بیداری کو وسیع تر اور مضبوط بنایا۔''(۱۰)

اُردو ادب میں روشن خیالی کا تصور بیسویں صدی کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں مولانا حسرت موہانی نے آنے والے انقلاب کی گھن گرج سن لی تھی اور اردوئے معلی میں اپنی دفاعی مزاحمت کی حکمت عملی کے ذریعے اس کی نوید سنائی تھی۔

۱۹۰۵ء میں پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ 'سوز وطن' شائع ہوا تو اسے حکومت نے ضبط کر لیا۔ ۱۹۱۱ء میں علامہ اقبال کی مشہور طویل نظم ''شکوہ'' نے ادبی حلقوں میں انقلاب برپا کر دیا اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔

مجموعی اعتبار سے ناقدین ادب اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اُردو ادب میں وسیع النظری، خرد افروزی اور روشن خیالی کے رُجحانات ترقی پسند ادب کی تحریک سے بہت پہلے ہی پروان چڑھ رہے تھے۔

پاکستانی معاشرہ

۱۴ راگست ۱۹۴۷ء ایک ایسا تاریخ ساز دن ہے، جس نے سندھ، مغربی پنجاب سرحد، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے خطے کو ایک آزاد مملکت پاکستان کا نام عطا کیا۔ یہ مملکت کتنی آرزوؤں، کوششوں اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی تھی مگر یہی وہ خونی تاریخ بھی ہے جب زمین بٹ گئی۔ خاندان تباہ ہو گئے عورتوں کے سہاگ اُجڑ گئے۔ بیٹیوں کی عصمتیں لٹ گئیں اور کتنے ہی بے قصور اس طرح قتل کر دیے گئے کہ ان کے لواحقین کو آج تک ان کی خبر ہے اور نہ ان کی قبر کی۔

تارکینِ وطن کی آبادکاری، علاج و معالجہ کی سہولت اور خوراک و ذریعہ معاش کی فراہمی نئی حکومت کی اوّلین ذمہ داری بن گئی۔ مالی دُشواریوں کے باوجود حکومت وقت ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے لگی۔

ادب جو انسانی معاشرے کا تخلیقی عکس پیش کرتا ہے۔ خارجی اور داخلی رُجحانات کی سمت بتاتا ہے۔ اپنی اسی صفت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی کے لیے لابدی ٹھہرتا ہے۔ وہ معاشرے کے بطن سے جنم لیتا ہے اور انسان کا ایک سماجی عمل ہے جو کسی قسم کی ماورائیت سے منسلک نہیں ہوتا۔ مصنف کی باطنی واردات معاشرے کے معروضی حالات سے پھوٹتی ہے۔ پاکستانی ادب بھی ان سارے حالات سے متاثر ہوا اور ادیبوں نے کسی حد تک اس کا تجزیہ بھی کیا۔

> ''پاکستان کا ادبی منظر نامہ اپنے ابتدائی دور ہی سے سیاسی، سماجی اور اسباب کی تاریخی صداقت اپنی جگہ لیکن اِس اکھاڑ پچھاڑ کے نتیجے میں جو خطۂ ارض آزاد ہوا اس میں فرد کی صورت حال بُری طرح مسخ ہوئی۔ معاشرتی انتشار، مالی لوٹ کھسوٹ اور تمدنی ابتری نے خرد کو ریزہ ریزہ کر دیا۔۔۔۔ قوموں کی تاریخ میں ایسے واقعات رُونما ہوتے ہیں اور لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر

اس کا مردانہ وار مقابلہ بھی کرتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے کوئی اجتماعی فکر وجود نہ پاسکی اور یہی وہ المیہ ہے جس نے پاکستان کی ادبی صورت حال پر گہرے اثرات مرتب کیے۔"(۱۱)

آزادی کے بعد کے ابتدائی تقریباً دس سالہ معاشرے کو اگر نثر اور خصوصاً فکشن کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں انسان بہت شرمندہ، مجبور اور بے بس دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہاں تنہائی اور محرومی کا احساس بڑی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ اس شکستہ منظرنامے میں ترقی پسند تخلیق کاروں نے اپنا کردار ادا کیا اور انھوں نے حالات کے اس کینوس پر بھی زندگی کے عکس تخلیق کیے۔

پاکستان میں فسادات کے موضوع پر جن اہم افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے ان میں سعادت حسن منٹو، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، عزیز احمد، خدیجہ مستور، انتظار حسین، اشفاق احمد اور ہاجرہ مسرور وغیرہ شامل ہیں۔ پہلے مارشل لاء دور یعنی ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۱ء تک میں جنرل ایوب خان کی آمرانہ حکومت نے سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے ایک ظالمانہ دور کا آغاز کیا اور اسی کے ساتھ اُردو فکشن میں بھی علامت نگاری کا آغاز ہوا۔ قرۃ العین حیدر کا یادگار ناول "آگ کا دریا" اسی دور میں مکمل ہو کر شائع ہوا، جس کا موضوع وقت کی جابرانہ اور اندھی قوت کے سامنے انسان کی بے بسی، بے وقعتی ہے۔ پاکستانی معاشرہ ان دنوں مختلف النوع تبدیلیوں سے گزر رہا ہے۔ نت نئے مسائل اور تضادات ہیں جو ہماری قومی زندگی کا حصہ بن رہے ہیں۔ دوسری جانب ہمارا یہی معاشرہ داخلی انتشار اور تقسیم در تقسیم کے تکلیف دہ عمل سے بھی گزر رہا ہے۔ تقسیم کی قوتیں انتہائی بے رحمی کے ساتھ انسانوں کے درمیان خلیج پیدا کر رہی ہیں۔ مذہبی انتہا پسندی اور نسلی و لسانی تفریق نے موت اور خوف کے تحفے عام کرنا شروع کر دیے ہیں۔ اس دور کے روشن خیال قلم کاروں میں حمزہ علوی، ممتاز حسین، سید محمد نصیر، ڈاکٹر تنویر احمد طاہر، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ،

اقبال احمد، اشفاق سلیم مرزا، ضیاالدین، انور احسن صدیقی، ریاض صدیقی، زاہدہ حنا، زرین فاطمہ اور شہناز شورو شامل ہیں۔

ترقی پسند رجحانات و میلانات کا تنقیدی محاکمہ

ترقی پسند ادبی تحریک نے ۱۹۳۵ء سے لے کر اب تک زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اس کی افادیت سے انکار کرنا حقائق سے منہ موڑنا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی اس کلیے سے اتفاق کرتے ہیں کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک نے خرد افروزی اور روشن خیالی کا جو چراغ روشن کیا تھا اس ایک چراغ سے ہی ترقی پسند تحریک نے ہزاروں چراغ روشن کر دیے جن کا پس منظر اور پیش منظر مندرجہ بالا ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔

ترقی پسندی کے پیدا کردہ رجحانات و میلانات کے نتیجے میں قومی اور سیاسی بیداری کا آغاز ہوا۔ خرد افروزی اور روشن خیالی کا شعور پیدا ہوا۔ سماج میں سیاسی بیداری کی اس جدوجہد سے بڑی اہم تبدیلیاں رُونما ہونے لگیں جن کا اثر شعر و ادب پر بھی پڑا اور پرانے دبستان، قدیم طرز کی شاعری اور فسانہ گوئی میں تدوین و تنسیخ ہونے لگی جو ترقی پسندی کی بڑی علامت رہی ہے۔ ترقی پسند رجحانات و میلانات کی حقانیت ان لوگوں کے بیانات سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو جدیدیت کے علمبرداروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک غیر ترقی پسند کا ترقی پسند تحریک کے بارے میں بیان دیکھیے:

> ''ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو یہ دونوں دھارے آپس میں مل گئے۔ چنانچہ تحریک نے اقبال کی رُومانیت سے تخلیقی قوت اور جوش کی رُومانیت سے بغاوت کا جذبہ حاصل کیا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری نے اِسے زمین کی طرف متوجہ کیا اور ان سب کے امتزاج کو بھی نوعِ انسان کی بہبود میں صرف

کرنے کے لیے ادب فکر کو داخل سے خارج کی طرف پیش قدمی کی راہ دکھائی۔"(۱۴)

حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد ہی اس کے زیرِ اثر جدید میلانات اور رُجحانات کی وجہ سے ہمارے ادب میں تخلیقی اور نظریاتی سطح پر سوچ کے نئے دھارے پھوٹے۔ شاعری اور فکشن میں نئے نئے تجربات ہونے لگے۔ حقیقت نگاری اور رُومانیت نئے مفاہیم سے روشناس ہوئے اور ادبی تنقید محض پسند ناپسند اور عروض پیمائی کی سطح سے بلند ہو کر ایک باضابطہ صنفِ ادب بن گئی۔

ترقی پسندوں پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ کلاسیکی ادب کے سرمائے کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ دریا بُرد کرنے کے حق میں ہیں۔ ایسے افراد میں ایک ترقی پسند ادیب حافظ کی شاعری پر فراریت اور عیش کوشی کا الزام عائد کرتے ہیں۔

حافظ کی غزلوں میں لذت پرستی بے ثباتی عالم، داخلیت، فرار اور زندگی کی تاریکیوں کو جامِ عیش میں ڈبو دینے کا وہ جذبہ رچا ہوا ہے جو خود حافظ کی زندگی میں رچ بس گیا تھا اور جو اس وقت تک ملک کے کسی شاعر کے یہاں اتنا حسین و دلکش بن کر نہیں آیا تھا۔ ترقی پسند مصنفین نے رنگ، نسل، مذہب، طبقے اور علاقائی و لسانی تعصبات کو ختم کیا۔ اگرچہ یہ تحریک اُردو طبقے نے شروع کی تھی۔ تاہم یہ برصغیر کی تمام زبانوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور ہر زبان میں ایسا ادب تخلیق کیا گیا جو ترقی پسند نظریات کا حامل تھا۔

عالمگیریت، موقع پرستی اور ادیب کا سماجی کردار

آج یہ چرچا ضرور ہے کہ دُنیا ایک ہی گاؤں یا قصبہ بن گئی ہے اور یہ بات کہ زر اندوزوں کے لیے خوشخبری ہے اور کم وسیلہ لوگوں کے لیے دھمکی ہے۔ دُنیا خود ایک گاؤں بن گئی ہے۔ اسی طرح عالمگیریت یا گلوبیت کے اثرات اور حکمتِ عملی سے آگاہ دانشوروں

کی رقت میں یہ کہہ کر کچھ کمی کی جاسکتی ہے کہ دُنیا کے جس حصے میں ابھی اکیسویں صدی طلوع نہیں ہوئی وہاں اکیسویں صدی کیسے قدم رنجہ فرما سکتی ہے۔ ماضی میں کائنات، حیات اور انسان کی ماہیت کے بارے میں شاعر کی بصیرت پر ایک زمانہ بھروسہ کرتا تھا لیکن اب سائنس دانوں اور عالموں پر انسانوں کا بڑا حصہ اعتماد کرتا ہے۔ اقبال نے ''پیامِ مشرق'' میں قیت نامہ سرمایہ دار و مزدور کے عنوان سے سرمایہ داری کے نظام پر قائم ورلڈ آرڈر کے جو خدوخال یا عہد نامہ پیش کیا ہے، میں ادیب کے بارے میں کوئی رومانوی تصور پیش نہیں کر رہا کیوں کہ دُنیا میں لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں جو لفظوں سے کھیلنے میں کبھی خرید کر کبھی بیچ کر۔ اس عہد کے بے بس اور بے کس لوگ یا شاید بے زبان لوگ اس کی کتاب خریدنے کی صلاحیت بھلے نہ رکھتے ہوں مگر ان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ ہمارا سچا دوست ہے۔

قلم کی حرمت کا خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ شعروادب کی دُنیا ہی ہے جہاں ریاکار بار ہا جی نہیں پاتا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جس رواداری، کشادہ دلی اور روشن خیالی کو ہم اپنے معاشرے میں عام کرنا چاہتے تھے۔

انجمن کی موجودہ صورت حال

انجمن کی تشکیلِ نو کے بعد کراچی اور لاہور کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں انجمن کی نشستیں منعقد ہونے لگیں۔ کراچی سے انجمن کے ''خبرنامے'' کا اجراء ہوا جس کے ابھی تک ۵ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس خبرنامہ کے ذریعہ کُل پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کارکردگی کا پتہ چلتا ہے۔

سندھ کے سیکرٹری احسان عظیم کے انتقال کے بعد جب جناب واحد بشیر کو ان کی جگہ نامزد کیا گیا تو انھوں نے مجلسِ منتظمہ کی اجازت سے انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان، کراچی کا جنرل سیکرٹری ڈاکٹر جمال نقوی کو نامزد کیا۔ ڈاکٹر جمال نقوی نے جنوری ۲۰۱۱ء

سے جب بحیثیت جنرل سیکرٹری چارج لیا تو اپنی کابینہ کو اس طرح مکمل کیا کہ علی اوسط جعفری کو جوائنٹ سیکرٹری، اے آر عارف کو فنانس سیکرٹری، اور سلیم الدین شیخ کو پبلسٹی سیکرٹری مقرر کیا۔ ۲۰۱۱ء کو انجمن نے فیض صدی تقریبات کے سال کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا بعد میں حکومت پاکستان نے بھی اسی سال کو فیض صدی کے طور پر منانے کا اعلان کیا۔ اس لیے کراچی کی انجمن نے اپنی ماہانہ نشستوں کو فیض یادگاری لیکچر کے طور پر منعقد کرنا طے کیا اور ہر تین ماہ بعد فیض مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ افتتاحی اور اختتامی اجلاسوں کے انعقاد کی ذمہ داری انجمن کی مرکزی کمیٹی نے لے لی ہے۔ ۲۰۱۱ء انجمن کی پلاٹینم جوبلی (۷۵ سال) کا بھی سال ہے۔ اس تعلق سے انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان، کراچی پلاٹینم جوبلی تقریبات کی میزبانی کرے گی۔ یہ تقریبا دسمبر ۲۰۱۱ء کے دوسرے ہفتہ میں منعقد کیے جانے کی تجویز ہے۔ پلاٹینم جوبلی تقریبات کمیٹی کا چیئرمین جناب مسلم شمیم اور سیکرٹری ڈاکٹر جمال نقوی کو اتفاق رائے سے منتخب کیا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد علی صدیقی، ترقی پسند ادب تحریکات ور جحانات، مشمولہ: ترقی پسند ادب، مرتبہ: قمر رئیس و عاشور کاظمی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷

۲۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۵۷ء، ص ۴۳۔۴۳

۳۔ احمد علی، ترقی پسند تحریک کا پس منظر، افکار، کراچی: مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۳۰

۴۔ سجاد ظہیر، روشنائی، ملتان: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۶

۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، روشن خیالی اور دانش ور، مشمولہ: ادب لطیف، ۵۵ سالہ نمبر، لاہور، دسمبر، ۱۹۹۰ء، ص ۸۳

۶۔ جمال نقوی، ڈاکٹر، ترقی پسند اُردو نثر کے پچاس سال، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء، ص ۱

۷۔ شمیم حنفی، جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷

۸۔ ممتاز حسین، پروفیسر، نقد حرف، مکتبہ اسلوب، کراچی: ۱۹۸۵ء، ص ۲۳۳

۹۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، سر سید احمد خاں ــــ ایک ترقی پسند مفکر، مشمولہ: العلم، کراچی، سلور جوبلی نمبر ۵، ص ۴۵

۱۰۔ سید احتشام حسین، پروفیسر، ذوق ادب اور شعور، لکھنؤ: فروغ اُردو لکھنؤ، ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۸

۱۱۔ محمد عالم خاں، چند نئے ادبی مسائل، لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۶۴

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۱ء، ص ۴۸۴

باب چہارم
ترقی پسند تحریک اور اہلِ دانش

تحریک خواہ فکری ہو یا سماجی ہو یا ادبی صرف چند افراد کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتی ہے۔اس کے پس منظر میں ایک تاریخ ساز بیداری ہوتی ہے۔اس طرح ہر تحریک بیداری کا پیغام سناتی ہے۔وہ معاشرے پر چھائے ہوئے جمود کو توڑتی ہے اور فکر و عمل کی روشنی سے اس معاشرے کو منور کرتی ہے۔ادبی تحریکیں تخیل کو نئی جہتیں دکھاتی ہیں اور فنی اظہار کے نئے سانچے تلاش کرتی ہیں۔اس کے لیے ایک وسیع تر حلقے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل ادبی فضا سازگار تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تحریک بڑے قلم کاروں کے فکر و شعور کی غذا بن گئی۔اس تحریک کی جڑیں چونکہ مضبوط تھیں اس لیے اس کی روحانی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا۔اس تحریک میں جہاں اعلیٰ تخلیقی قوت کے ماہر ادیب شامل ہوئے وہاں اوسط صلاحیت کے حامل فنکار بھی اس تحریک کا حصہ ہے۔اس تحریک سے وابستہ صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ناقدین نے مستقل کتابیں تصنیف کیں، مگر اس تحریک سے وابستہ اوسط درجے کے شاعر اور ادیب یکسر نظر انداز کر دیے گئے۔حالانکہ ترقی پسندی کی تحریک میں ان کا ادبی حصہ بھی کچھ کم نہ تھا۔

'پاکستان میں ترقی پسند ادب کے معمار' (جلد اول) جمال نقوی کی ایک ایسی ہی کاوش کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے مرحوم ترقی پسند اہلِ دانش کا انسائیکلو پیڈیا مرتب کیا ہے۔انہوں نے مقبول شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ نظر انداز کیے گئے یا کم شہرت یافتہ ترقی پسند تحریک کے ادیبوں اور شاعروں کے کوائف بھی بیان کیے ہیں۔ جمال نقوی نے

اس کتاب میں ۲۷ ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں، دانشوروں اور نقاد حضرات کو جگہ دی ہے۔

ذیل میں ہم اس کتاب میں موجود شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، خواتین ادیب، نقاد، دانش ور اور مضافاتی علاقوں سے تعلق رکھنے والے ان افراد کی فہرست مرتب کریں گے جو اس تحریک کا باقاعدہ حصہ رہے ہیں۔

شاعر

سب سے پہلے ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں کی بات کرتے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں ترقی پسند خیالات کو نہایت عمدگی اور مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس تحریک سے وابستہ جن شاعروں کے بارے میں ڈاکٹر جمال نقوی نے خاکے رقم کیے ہیں:

ان میں ابن انشاء، احمد راہی، احمد فراز، اظہر جاوید، اظہر قادری، انجم اعظمی، انور احسن صدیقی، جاوید شاہین، جوش ملیح آبادی، جون ایلیا، حبیب جالب، حسن حمیدی، حسن عابد، حسن عابدی، خالد علیگ، خیال امروہوی، رضا ہمدانی، شور علیگ، شیخ ایاز، صہبا لکھنوی، ظہیر کاشمیری، عبداللہ ملک، عبدالروف عروج، عزیز حامد مدنی، فیض احمد فیض، قمر ہاشمی، مجیب خیر آبادی اور مصطفیٰ زیدی شامل ہیں۔

افسانہ نگار، ناول نگار

شاعری کے ساتھ ساتھ اس تحریک کی ترویج و ترقی میں ترقی پسند افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس تحریک کو قوت بخشی۔ ذیل میں ان افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی فہرست ملاحظہ ہو جو اس تحریک کا مضبوط حوالہ ہیں:

آغا سہیل، ابراہیم جلیس، احمد علی، احمد ندیم قاسمی، اظہر قادری، اختر حسین رائے پوری، حمید اختر، حمید کاشمیری، خدیجہ مستور، رفیق چوہدری، ریاض روفی، سعادت حسن منٹو، شوکت صدیقی، عزیز احمد، غلام عباس، قیوم راہی، مجنوں گورکھپوری، محمد خالد اختر، میرزا ادیب، نعیم آروی، ہاجرہ مسرور، کمانڈر رسید انور۔

خواتین

ترقی پسند تحریک میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین ادیبوں نے بھی فعال کردار ادا کیا اور ترقی پسندی اور روشن خیالی کی اپنی تحریروں کے ذریعے ترویج کی۔ ان میں درج ذیل خواتین شامل ہیں: خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور۔

نقاد

تنقید کسی بھی ادبی تحریک کا اہم جزو ہوتی ہے۔ ہر ادبی تحریک نے اعلیٰ پائے کے نقاد پیدا کیے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کی دنیا میں بہترین نقاد پیدا کیے جن کا کام ان کی پہچان ہے۔ ذیل میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ نقادوں کی فہرست ملاحظہ ہو:

ڈاکٹر حنیف فوق، عبادت بریلوی، عبدالروف عروج، مجنوں گورکھپوری، محمد علی صدیقی، مطلبی آفریدی، پروفیسر ممتاز حسین، مجتبیٰ حسین۔

دانش ور

ترقی پسند تحریک ایک ادبی تحریک تھی جس سے ادیب بلاواسطہ اور بالواسطہ ہر دو طرح سے متاثر ہوئے۔ اس تحریک کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب میں عقلیت پسندی کو

فروغ دیا گیا۔ ترقی پسند تحریک نے ایسے دانش دنیائے ادب کو دیے ہیں جو ادبی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ دانش ور درج ذیل ہیں:

عبداللہ ملک، سید سبط حسن، اختر حسین رائے پوری۔

مضافاتی

ترقی پسند تحریک کا اثر صرف مرکزی علاقوں تک محدود نہیں تھا بلکہ ملک کے دور افتادہ علاقوں میں بسنے والے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اس تحریک سے اثرات قبول کیے ہیں۔ مضافاتی علاقوں میں رہنے والے شاعروں اور ادیبوں نے اس تحریک کے زیر اثر اعلیٰ ادب تخلیق کیا ہے۔ ذیل میں مضافاتی علاقوں سے تعلق رکھنے والے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی فہرست ملاحظہ ہو:

قلندر مومند، فارغ بخاری، میر گل خاں نصیر، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، احمد فراز، اجمل خٹک۔

ذیل میں ہم ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں، خواتین ادیب، نقادوں، دانش وروں اور مضافاتی علاقوں سے تعلق رکھنے والے چند ترقی پسند اہل قلم کے بارے میں لکھیں گے تاکہ جمال نقوی کے خاکوں کے نمونے پیش کر رہے ہیں تاکہ ان کی مختصر تحریر کا حسن سامنے آ سکے:

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو اردو افسانے کا ایک تابندہ ستارہ ہے جس نے معاشرے کی حقیقتوں کو پوری سچائی اور بے باکی کے ساتھ بیان کیا۔ سعادت حسن منٹو ایک ترقی پسند افسانہ نگار

تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مختلف موضوعات کو جگہ دی۔ باری علیگ نے سعادت حسن کے اندر چھپے ہوئے اس تخلیق کار منٹو کو متعارف کروایا۔ جس کے قلم میں لکھنے کی قوت موجود تھی مگر اس کو راہنمائی کی ضرورت تھی۔ باری علیگ نے اس ضمن میں منٹو کی راہنمائی کی اور اسے ادبی دنیا میں متعارف کروایا۔ منٹو میں مطالعہ کا شوق پوری شدت کے ساتھ موجود تھا۔ چنانچہ وکٹر ہیوگو، گورکی اور موپساں کی کتابیں زیر مطالعہ رہنے لگیں۔ منٹو نے سماجی حقیقت پسندی کی شاہراہ پر اپنے ادبی سفر کو جاری رکھا۔ ان کے بارے میں کہا گیا:

''منٹو نے ترقی پسند تحریک کی فروغ دی ہوئی انسان دوستی کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے اور ان کے فن کے تابندہ نقوش میں انسانی آدرشوں کی روش ملتی ہے۔۔۔ منٹو نے اپنے دور کے منافقانہ رویوں، جبر کی ذہنی اور عملی صورتوں کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ منٹو کا مقصد زندگی کی نئی ترتیب ہے۔'' (۱)

منٹو کی مریضانہ جنس پرستی اور جنون پسندی پر شدید اختلاف کے باوجود اس کی افسانوی تکنیک، شہری زندگی کا عمیق مطالعہ ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ افسانہ نویسی کا ارتقاء ۱۹۳۶ء سے ہوتا ہے۔ اس عہد میں پرانے اور نئے افسانہ نویسوں نے اس فن کو سربلند کیا۔ نئے موضوعات کی تلاش میں پرانے افسانہ نگار ایک خاص منزل تک پہنچ کر میدان سے ہٹ گئے لیکن انھوں نے نئے آنے والوں کی راہ میں چراغ جلا دیے۔ اس دور میں شہرت اور اہمیت کے لحاظ سے کرشن، بیدی، عصمت اور منٹو کے کارناموں پر نگاہ پڑتی ہے جن میں سے ہر ایک نے فکر و فن موضوع و مواد اور انداز بیان پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

منٹو کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا گیا:

''منٹو کا فنی شعور غالباً افسانہ نویسی کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ اس میں ایک طرح کا فطری بہاؤ اور ایک قسم کی زبردست آمد تھی۔ ان کے متعدد افسانے اس عہد کی افسانہ نویسی کا لازوال سرمایہ ہیں۔'' (۲)

ہمارے یہاں آزادی کے بعد افسانہ نگاروں میں سے بیشتر نے حقیقت نگاری کو اپنایا۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد فسادات، نقل مکانی، اقدار کی شکستگی، ہوس اور اسی قسم کے رجحانات کے پس منظر میں افسانے تحریر کیے گئے۔ سعادت حسن منٹو نے لازوال افسانے تحریر کیے۔ جن میں بابو گوپی ناتھ، ممی، موذیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ شامل ہیں۔ انہوں نے بعض ایسے افسانے بھی تحریر کیے جن میں جنس کا ذکر آتا ہے۔ ان میں کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، بو وغیرہ شامل ہیں۔ ان افسانوں کی بدولت سعادت حسن منٹو پر فحش نگاری کا الزام آتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی برائیوں کو پوری سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو اپنے معاملات میں کسی روک ٹوک کے قائل نہیں تھے۔ وہ آزادیٔ فکر و عمل پر یقین رکھتے تھے۔ ان کی فکر گفتگو اور تحریر میں روشن خیالی، حقیقت پسندی اور ترقی پسندی قائم رہی۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر ہمیشہ الزامات لگتے رہے ہیں مگر انہوں نے پوری قوت کے ساتھ برائی کے خلاف جنگ لڑی ہے اور معاشرے کی منافقت کو اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ ان پر فحش نگار ہونے کا الزام ہے مگر لوگ اس فحش نگاری کے پیچھے چھپے اس کرب کو محسوس نہیں کرتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو اردو افسانے کا ایک اہم ستون ہے۔ جس نے اپنے افسانوں میں ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کے مسائل اور ان کی ذہنی سطح کو پوری سچائی اور ایمان داری کے ساتھ بیان کیا ہے۔

عزیز احمد

افسانہ نگار، ناول نگار اور تاریخ نویس عزیز احمد نے ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ بھی ترقی پسند معیارات اور روشن خیال تصورات سے بہت متاثر ہوتے۔ عزیز احمد مارکسی ادب سے متاثر ہوئے اور ایک کتاب "ترقی پسند ادب" کے نام سے تحریر کی۔ جس میں حقیقت نگاری، انقلابی قدریں، اردو ادب و جدید تحریک کے

علاوہ ادب کے مختلف شعبوں یعنی ترقی پسند شاعری، ترقی پسند افسانہ اور ناول، ترقی پسند ڈراما پر کھل کر بات کی۔ اردو ادب کی تاریخ عزیز احمد کے ذکر کے بنا مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ان کے بارے میں یوں تحریر کیا گیا:

"عزیز احمد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انہوں نے ہر میدان میں خواہ وہ افسانہ نگاری ہو یا ناول نویسی انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔"(۳)

عزیز احمد نے ترقی پسند تحریک کو مخصوص نقطہ نظر سے دیکھا اور ادبی تاریخ کی روشنی میں اس تحریک اور نظریے کی اہمیت اور قدر و قیمت کو واضح کرنے کی کوشش کی اور وہ بہت حد تک اس میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ ترقی پسندی اور روشن خیالی کے سخت حامی تھے۔

عزیز احمد نے ترقی پسند تحریک سے جو تعلق پیدا کیا تھا۔ اس کی بنا پر ۱۹۴۱ء۔۱۹۴۲ء میں انہوں نے رسالہ "اردو" میں قسط وار مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے اپنے ان مضامین میں ترقی پسندی کا ایک متوازن تصور پیش کیا۔ مضامین کی پسندیدگی کے پیش نظر ۱۹۴۵ء میں وہ کتابی صورت میں "ترقی پسند ادب" کے نام سے منظر عام پر آئی۔ ترقی پسند تحریک سے اپنے تعلق اور دلچسپی کے بارے میں انہوں نے یوں تحریر کیا ہے۔

مجھے یاد ہے ۱۹۳۵ء میں ملک راج آنند نے انگلستان میں مجھ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کی ضرورت کا کئی بار ذکر کیا تھا۔ جب انگلستان میں یہ انجمن قائم ہوئی تو اس کے دو ایک جلسوں میں ان کی دعوت پر شریک بھی ہوا۔۔۔ پھر ترقی پسندی کی تحریک ہندوستان میں اس تیزی کے ساتھ بھڑک اٹھی کہ اسے کسی انجمن کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

ایک منفرد ترقی پسند سوچ رکھنے کی وجہ سے اختلافات کے باوجود ترقی پسند ادب میں ان کی کارکردگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تصانیف میں ناول، تراجم اور تاریخی تصانیف شامل ہیں۔ لندن کے قیام کے دوران عزیز احمد کو مسلمانوں کے تمدن سے دلچسپی

ہوئی اور انہوں نے تاریخ کے موضوع پر لکھنا شروع کر دیا۔ یہیں سے انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ اس دور میں جو کتابیں انہوں نے لکھیں ان کی عالمانہ حیثیت پر بین الاقوامی علمی حلقے مہر اعتراف ثبت کر چکے ہیں۔ انہیں رائل سوسائٹی آف کناڈا کا فیلو بھی بنایا گیا۔ ان کی اہم کتابوں میں گریز، مرمر اور خون ہوس، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی اور شبنم جیسی ناولیں اور ترقی پسند ادب جیسی تحریریں شامل ہیں۔

فیض احمد فیض

فیض کا نام آتے ہی ذہنوں میں ان کی شاعری اور خصوصاً ان کی مترنم اور ترقی پسند غزلوں کے اشعار گونجنے لگتے ہیں لیکن ان کی ہشت پہلو شخصیت نے انھیں شاعری کے کوچے کے علاوہ معلمی، عسکری خدمات، فنون لطیفہ، ادارت، صحافت، ڈرامہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے بھی پہچان دی تھی۔ ان تمام شعبوں میں ان کی انسانی اور سماجی قدروں سے محبت ہی ان کی پہچان بنتی ہے اور یہ شعور ان کو ترقی پسند تحریک نے دیا تھا۔

فیض صاحب نے مارکسی نظریات کو پوری طرح سمجھا تھا اور وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے بانیوں میں تھے۔ چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے اپنی وابستگی کا پس منظر انھوں نے یوں بیان کیا:

> ''جب ۱۹۳۵ء میں امرت سر میں پڑھاتے تھے تو محمود الظفر اور ان کی بیگم نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ایک ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور ہماری خواہش ہے کہ یہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم ہو جائے۔ تو ہم نے اس تنظیم میں دلچسپی ظاہر کی۔ اس لیے ہم نے غم جاناں کو چھوڑ کر دنیا کے غموں پر نظر کی اور ان کو بیان کیا۔'' (۴)

انہوں نے اپنے ایک مضمون میں جمالیات اور افادیت کے امتزاج پر زور دیا ہے۔

ان کے خیال میں حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں افادی فعل ہے۔ اگر کسی شاعر کا کلام جمالیاتی تاثر کے لحاظ سے ناقص ہے تو یہ نقص اس کی افادیت پر بھی اثر انداز ہوگا۔ آخر میں وہ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ بتاتے ہیں:

۱۔ شعر کی جمالیاتی قدر کافی حد تک شاعر کی دوسری قدروں پر منحصر ہے۔

۲۔ ان قدروں کی ترتیب ان کی سماجی اہمیت کے مطابق ہونا چاہیے۔

۳۔ جمالیاتی قدر بھی ایک سماجی قدر ہے جو اجتماعی مفاد میں اضافہ کرتی ہے۔(۵)

ان کی پہلی شائع ہونے والی نظم "میرے معصوم قاتل" کالج کے مجلّے میں ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں ان کا اولین مجموعہ کلام نقش فریادی شائع ہوا جس کے پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کا کلام ہے اور دوسرے حصے کی بیشتر تخلیقات امرتسر میں تخلیق ہوئی ہیں۔ امرتسر میں ہی ان کی ملاقات سید سجاد ظہیر سے ہوئی اور وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل میں لگ گئے۔ فیض نے شعبہ تعلیم کے بعد شعبہ صحافت میں بھی یادگار کام کیا۔ انہوں نے کسانوں، مزدوروں اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس راہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں اور جلاوطنی کے دکھ بھی جھیلنے پڑے لیکن وطن کی محبت انہیں ہر بار کھینچ لاتی۔ فیض نے اپنی شاعری میں اپنی محبوبہ وطن کو قرار دیا ہے۔ ۸ شعری مجموعوں میں انہوں نے اپنی ترقی پسند فکر کو سمو دیا ہے۔ انہیں ساری دنیا سے محبتیں بھی ملیں اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ نوبیل پرائز کے لیے نامزد ہوئے اور ۱۹۶۲ء میں لینن امن انعام کے حقدار قرار پائے۔ بظاہر ست اور کاہل فیض نے فوج کے شعبہ تعلقات عامہ پروگریسو پیپرز کے چیف ایڈیٹر اور پاکستان آرٹس کونسل لاہور کے سیکرٹری کی حیثیت سے نمایاں کارکردگی دکھائی۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے کلام کے تراجم ہوئے۔ فیض کا نام ملکی صحافت، قومی ثقافت، آرٹ، ادب اور شاعری کی زینت بنا۔ ۲۰۱۱ء کو "فیض صدی

تقریبات" کے سال کے طور پر دنیا کے ۱۰۹ ممالک میں منایا گیا۔

• •

خدیجہ مستور

پاکستان میں اُردو افسانے کا سفر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھی جانے والی تخلیقات سے شروع ہوا تھا۔ جس کے سرخیلوں میں پروفیسر احمد علی شوکت صدیقی، غلام عباس، سعادت حسن منٹو اور کم عمر افسانہ نگاروں میں ترقی پسند تحریک سے براہ راست متصل ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور شامل ہیں۔

خدیجہ مستور کے چار افسانوی مجموعے ٹھنڈا میٹھا پانی، تھکے ہارے، چند روز اور بوچھار اور رکھیل شائع ہوئے۔اس کے علاوہ ان کے دو ناول زمین اور آنگن ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے ذہنوں پر وہ اثر ڈالا تھا کہ ایک بار اس سے متعارف ہونے والا ہمیشہ کے لیے اس کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ لیکن بات ان سچے ترقی پسندوں کی ہے جنہوں نے اسے فیشن کے طور پر قبول نہیں کیا تھا بلکہ پوری طرح سمجھ بوجھ کر اس کے بنیادی اصولوں اور جدلیات کے فلسفے پر ایمان لا کر مارکس کو علامہ اقبال کی فکر کے مطابق سمجھا گیا تھا۔

خدیجہ مستور بھی ایسے ہی ترقی پسندوں میں شامل تھیں جنہوں نے جب ایک بار ترقی پسندی کے مفہوم کو سمجھ لیا تو پھر وہ ہر طوفان کے سامنے اپنے سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کی طاقت کے سہارے ڈٹ گئیں وہ اپنے دور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کو اپنا موضوع بھی بناتی رہیں اور عملی طور پر انھیں برت کر بھی دکھایا۔اس بارے میں ایک مضمون میں لکھا گیا:

> "خدیجہ آپا ان گنے چنے ادیبوں میں سے تھیں جنہیں اپنا سیاسی نظریہ بے حد عزیز تھا اس کے لیے انہوں نے کبھی کسی سطح پر سمجھوتہ قبول نہیں کیا۔ترقی پسند تحریک میں صرف چند ایک ادیب ایسے تھے جنہوں نے لکھنے کے ساتھ عملی طور پر اس تحریک کو آگے بڑھایا۔"(۶)

خدیجہ مستور نے ۱۹۴۲ء سے لکھنا شروع کیا اور ابتدائی کہانیاں، خیال اور عالمگیر میں شائع ہوئیں۔ ان کے ناول آنگن کو آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا اور ادبی حلقوں میں ''آنگن'' کی پذیرائی کی گونج سی گئی اور ان کا یہ اعزاز آج بھی باقی ہے۔

جدید اردو ناول اور افسانے کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی تو خدیجہ مستور کا ذکر ضرور آئے گا جنہوں نے بہترین افسانوں کے ساتھ ہی آنگن لکھ کر اردو فکشن میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا اس لیے ایک مختصر لیکن اہم تاریخ ادب میں ان کے متعلق یوں تحریر کیا گیا:

> ''خدیجہ مستور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہیں ان کا ایک اچھا ناول آنگن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے پس منظر میں بھی لکھنو کی تہذیبی زندگی اور ۱۹۴۷ء کے واقعات کا تانا بانا ہے۔ واقعات زیادہ تر گھریلو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔'' (۷)

ترقی پسندی مقصدیت کو بڑی اہمیت دیتی ہے۔ اس لیے ادب برائے زندگی کی قائل ہے اور خدیجہ مستور کی تحریروں میں زندگی کے سارے رنگ نظر آتے ہیں۔

ترقی پسندی کے دیے ہوئے شعور کی بنیاد پر خدیجہ نے جو بھی تحریر کیا وہ مقدار کے اعتبار سے بھلے کم ہے مگر معیار کے اعتبار سے بہت اعلیٰ ہے۔

سید سبط حسن

مسلمانوں کا ماضی بہت تابناک رہا ہے۔ اس زمانے میں مسلم قوم نے قرآن کریم کی دعوت فکر کو اپنا لائحہ عمل بنایا تھا۔ لیکن جب مسلمان تحقیق و جستجو سے دور ہو گئے۔ تو پستی ان کا مقدر بن گئی۔ یہ دور وہ تھا جب معقولات کے بجائے منقولات کو ترجیح دی گئی اور تحقیق کے بجائے تقلید کو لازم قرار دیا گیا۔ سر سید نے زوال قوم کے اسباب کو سمجھ کر معقولات پر مبنی خرد

افروز اور روشن خیال دانش وری کی ابتدا کی۔ علامہ اقبال بھی سرسید کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے اپنے خطبات میں اس بات کی تائید کی ہے کہ اب مسلمانوں کو ایک نئے علم الکلام کی ضرورت ہے۔ سرسید اور علامہ اقبال کی طرح ممتاز ادیب اور صحافی سبط حسن کی زندگی کا مقصد بھی خرد افروزی اور روشن خیالی کی تحریک کو آگے بڑھانا تھا۔ جیسے ایک مضمون "سید سبط حسن اور معقولیت" میں یوں بیان کیا گیا:

> "سبط صاحب کو قید و بند کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑے لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی۔۔۔ انھوں نے نہ صرف روایت کو بلا سوچے سمجھے اپنایا نہیں بلکہ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ سائنسی خطوط میں ڈھالا جو غیر سائنسی مزاجوں کے لیے بالکل ہی ناقابلِ برداشت تھا ان کی تمام تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ انھوں نے معقولیت اور روشن خیالی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔" (۸)

اپنی سیاسی و سماجی مصروفیات کے ساتھ ہی وہ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہے اور متعدد کتابیں لکھیں جن میں شہر نگاراں، ماضی کے مزار، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، موسیٰ سے مارکس تک، انقلاب ایران، نوید فکر، افکار تازہ، ادب اور روشن خیالی، سخن در سخن ہیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

اپنے فکری مضامین کے ایک مجموعے میں انھوں نے علامہ اقبال، قائداعظم کے بیانات اور تحریروں کے ذریعہ پاکستانی معاشرے کے تناظر میں گفتگو کی ہے۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء میں قائداعظم نے جو کچھ فرمایا اس بارے انہوں نے تحریر کیا:

> "ہم کس چیز کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، ہمارا نصب العین کیا ہے ہم تھیوکریسی کے لیے نہیں کر رہے ہیں۔ نہ ہمارا مقصد تھیوکریٹک ریاست قائم کرنا ہے۔ بہر صورت پاکستان تھیوکریٹک ریاست نہیں ہونے والا۔ جہاں

ملاؤں کی حکومت ہو جن کا خیال ہے کہ ان کو الوہی فریضہ سونپا گیا ہے۔"(۹)

سر سید احمد خاں اور ڈاکٹر محمد اقبال کی دی ہوئی عقلیت پسندی کے مبلغ، خرد افروزی، ترقی پسندی اور روشن خیالی کے مفکر اور ایک اہم سماجی فلسفی سید سبط حسن نے برصغیر پاک و ہند میں ترقی پسند تحریک کے بھلائے ہوئے روشن خیالی اور خرد افروزی کے عالمی شعور کو فروغ دینے میں اپنی جدلیاتی فکر کے ذریعے اہم کردار ادا کیا ہے۔ سنجیدہ تر مضامین اور فلسفیانہ مباحث کو سادگی و پرکاری اور شگفتگی و معنویت کے ساتھ پیش کر کے ان کی تحریروں نے سماجی زندگی میں ایک فکری انقلاب برپا کیا۔

۱۹۸۶ء میں انجمن کی گولڈن جوبلی تقریبات منعقدہ لندن، کراچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے لیے کام کرتے رہے اور دہلی میں انہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ کانفرنس سے واپسی کے موقع پر دہلی میں ان کے دل نے ساتھ چھوڑ دیا۔

مجنوں گورکھپوری

پروفیسر احمد صدیقی مجنوں گورکھپوری کی ادبی زندگی چار نمایاں پہلوؤں پر مشتمل تھی۔ یعنی شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور استاد۔ وہ ایک ہمہ جہت ادیب تھے لیکن ادب کی ان راہوں پر چلتے ہوئے انہیں ایک منزل پر پہنچ کر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ان کا اصل منصب شاعری یا افسانہ نگاری نہیں بلکہ تنقید ہے۔ ۱۹۳۴ء میں اپنے دوسرے افسانوی مجموعے کا مقدمہ بعنوان گریز کی ابتدا ہی میں انہوں نے تحریر کیا۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں یہ کہے جاؤں گا کہ افسانہ میری ادبی زندگی کا نصب العین نہیں تھا اور شاید اب بھی نہیں ہے۔"(۱۰)

اس لیے وہ تنقید کی طرف مائل ہو گئے اور ۱۹۷۳ء میں شبنم رومانی کی ترتیب کردہ اپنی آخری کتاب "غالب شخص و شاعر" تک تنقید سے ہی منسلک رہے۔

تنقید ادب کی رہنمائی کا کام انجام دیتی ہے اور اسے تراش کر ہتر سے بہر ابنا دیتی ہے۔ مجنوں صاحب کی اولین تنقیدی کتاب ادب اور زندگی نے اردو ادب میں یہی کام انجام دیا ہے۔ اس کے حوالے سے ایک مضمون ''مجنوں گورکھپوری۔ ایک تاثر'' میں ان کی نظریاتی تنقید کے بارے میں تحریر کیا گیا۔

مجنوں گورکھپوری ۱۹۳۶ء سے باقاعدہ طور پر نظریاتی تنقید کے میدان میں آئے، وہ مارکس کے مطالعے سے بہت پہلے زندگی کی جدلیات کا احساس رکھتے تھے۔ ادب اور زندگی نیا ادب کیا ہے، ادب اور ترقی، ادب کی جدلیاتی ماہیت، نئی اور پرانی قدریں، تخلیق اور تنقید اور ادب اور مقصد جیسے مضامین نظریاتی تنقید میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور مجنوں کتاب ''ادب اور زندگی'' میں شامل ہیں۔

مجنوں گورکھپوری ایک وسیع المطالعہ اور ہمہ جہت ادیب تھے اس لیے انہیں جامع الکمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ تاریخ جمالیات، کلاسیکل اور جدید شاعری پر جب انہوں نے مضامین لکھے تو کمال کر دیا۔ ان کے تراجم پر طبع زاد کا گمان ہوتا تھا اور ان کے فلسفیانہ مباحث میں علم کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔

مجنوں صاحب کی علمیت نے انہیں روشن خیالی اور ترقی پسندی کا شعور برصغیر میں اس تحریک کی ابتداء سے بہت پہلے ہی عطا کیا تھا۔ ان کے دس مضامین کا مجموعہ ادب اور زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک اچھے نقاد میں جن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب مجنوں صاحب میں موجود تھیں۔ وہ چیزوں کو سطحی نظر سے دیکھنے کے بجائے ان کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ادب، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، فلسفہ ونفسیات اور سائنس ان تمام علوم ان کو دخل تھا اور انہیں کی روشنی میں وہ ادب کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ان کی تصانیف کی ایک لمبی فہرست ہے جس میں چودہ تنقیدی کتابیں، دس افسانوی مجموعے اور ناولٹ، آٹھ تراجم مثنوی زہر عشق اور مثنوی حسن فطرت سے متعلق ان کی دو

تالیف ہیں۔ جب کہ ان کی بہت سی تحریریں مختلف جرائد میں بکھری ہوئی ہیں۔

میر گل خان نصیر

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھنے والوں میں صرف مرکزی علاقوں کے افراد شامل نہیں ہیں بلکہ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ علاقوں میں بھی اس تحریک کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں بلوچستان کی ایک ہردلعزیز شخصیت میر گل خان نصیر بھی شامل ہیں۔ میر گل خان کو ملک الشعرا کا خطاب دیا گیا آپ ایک مقبول سیاست دان، ایک قوم پرست شاعر ایک تاریخ دان اور صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ان کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں اور ہر جہت اپنی جگہ مکمل اور بھرپور ہے۔ میر گل خان نصیر کا تعلق بلوچستان کے شہر نوشکی سے ہے۔ ابتدائی تعلیم کوئٹہ میں حاصل کرنے کے بعد آپ اسلامیہ کالج لاہور مزید تعلیم کے حصول کے لیے آئے۔ اسلامیہ کالج لاہور ادبی و سیاسی سرگرمیوں کا گڑھ تھا۔ انہی سرگرمیوں نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ میر عطا اللہ مینگل کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران آپ صوبائی وزیرِ تعلیم صحت اور انفارمیشن جیسے اہم عہدوں پر فائز رہے بعد میں جب مینگل حکومت کو برطرف کر کے اس کی قیادت کو جیل میں بند کیا گیا تو اس میں میر گل خان بھی شامل تھے۔ بعد میں بننے والی پاکستان نیشنل پارٹی کے وہ صوبائی صدر رہے۔ سب سے پہلے مچھ جیل میں تخلیق کردہ ان کی کتاب ''بلوچی رزمیہ شاعری'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

اسی سال انہوں نے اسیری کی حالات میں سینٹرل جیل حیدر آباد میں شاعری کی کتاب بلوچی عشقیہ شاعری تخلیق کی۔ ۱۹۸۰ء میں فیض کے شعری مجموعے ''سرِ وادیِ سینا'' کا بلوچی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ ۱۹۸۲ء میں ان کی اہم تاریخی کتاب بلوچستان۔ قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں شائع ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے شاہ لطیف کے کلام کے کچھ

حصوں کا ترجمہ کر کے شاہ لطیف گشت کے نام سے شائع کیا۔ تنظیمی طور پر وہ انجمن ترقی پسند مصنفین، بلوچستان کے بانیوں میں شامل تھے۔

حوالہ جات

۱۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، منٹو اور سخن ہائے گفتنی، مشمولہ: منٹو ایک کتاب، مرتب صبا لکھنوی، مکتبہ افکار، کراچی: ۱۹۹۳ء، ص ۱۳

۲۔ احتشام حسین، پروفیسر، ایضاً، ص ۳۷

۳۔ ممتاز حسین، پاکستانی معاشرہ اور اردو تنقید، مشمولہ: پاکستانی معاشرہ اور ادب، مرتب ڈاکٹر حسین محمد جعفری و احمد سلیم، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی: ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۷

۴۔ سبط حسن، سخن در سخن، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۷ء، ص ۵۳

۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، میزان پر ایک نظر، مشمولہ: معیار فیض نمبر دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۹۰

۶۔ جیلانی بانو، میرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ، مشمولہ: فنون خدیجہ مستور نمبر، لاہور: ۱۹۸۴ء، ص ۳۶

۷۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، زندگی کی شام، ایک مختصر گفتگو، مشمولہ: فنون خدیجہ مستور نمبر، لاہور: ۱۹۸۴ء، ص ۲۱۵

۸۔ سبط حسن، ماضی کے مزار، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۲ء، ص ۷۔۸

۹۔ سبط حسن، نوید فکر، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳

۱۰۔ مجنوں گورکھپوری، سمن پوش اور دوسرے افسانے، دہلی: کتب خانہ علم و ادب، ۱۹۳۳ء، ص ۲۰

ماحصل

ڈاکٹر جمال نقوی ایک ہمہ جہت ترقی پسند دانشور ہیں ان کی حیثیت ترقی پسند تحریک کے جدید منظرنامے پر ایک معمار کی سی ہے۔ جنھوں نے اس تحریک کے نظریے کے پرچار کے لیے کئی ایک وسائل استعمال کیے۔ جمال نقوی کی شخصیت کے کئی ایک اطراف ہیں جو اپنی جگہ بھرپور ہیں۔

جمال نقوی کا تعلق چونکہ علم وادب کے گہوارے لکھنؤ سے ہے اس لیے انہیں آغاز ہی سے علمی وادبی ماحول میسر آیا۔ جس نے ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے پھر مادرِ علمی علی گڑھ نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور ان کو ایک کامیاب انجینئر کے ساتھ ساتھ ایک ادیب کی صلاحیتوں کو بھی اجاگر ہونے میں مدد دی۔ ان کی تحریروں میں ادب اور سائنس کا خوبصورت امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ انجینئرنگ ان کا پیشہ ہے، ادب ان کا ذوق۔ ان دونوں شعبوں میں انہوں نے یکساں طور پر اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا اندازہ ان کو ملنے والے اعزازات اور مختلف شعرا اور ادبا کی ان کے متعلق رائے سے لگایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک جمال نقوی کے شعری سفر کی بات ہے تو ان کی شاعری میں ترقی پسند نظریات کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں ابلاغ کا عنصر بھی نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ ان کا جمالیاتی ذوق پوری رعنائی وتوانائی کے ساتھ ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ جمال نقوی نے اپنے شعری سفر میں غزل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا بلکہ اس روایت کو خوش

اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔

ان کی شاعری میں ایک ٹھوس سماجیت کی شکل ملتی ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں موجودہ دور کے مسائل کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جمال نقوی کی شعری زبان سلیس اور رواں ہے۔ان کی نظموں میں اجتماع سے خطاب کے ساتھ ذات سے مکالے کا انداز بھی ملتا ہے۔ان کی شاعری میں عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ کلاسیکی رچاؤ بھی نظر آتا ہے۔ جوان کی شخصیت کا حصہ ہے کیونکہ لکھنؤ اور علی گڑھ نے ان کی شخصیت کی بھر پور نشوونما کی ہے۔جو کہ ان کی تحریروں میں واضح طور پر جھلکتی ہے۔

انہوں نے اپنی نظموں میں موجودہ معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ جمال نقوی نے ہائیکو بھی تخلیق کی ہے۔ان تین سطری نظموں میں بھی جمال نقوی کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی ملتی ہے۔انہوں نے ہائیکو کے ذریعے بھی معاشرتی معاملات کی طرف نگاہ کی ہے۔غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں پر بھی جمال کی گرفت مضبوط ہے۔ جمال نقوی نے اپنی علمی وادبی شوق کو بڑے توازن وتواتر کے ساتھ رکھا ہے۔وہ جتنے فعال شاعر ہیں اتنے ہی متحرک و مستعد نثر نگار بھی ہیں۔

ڈاکٹر جمال ۹۰ء کی دہائی سے ترقی پسند تحریک سے باقاعدہ طور پر وابستہ ہیں۔انہوں نے اس تحریک کے زیر اثر نہ صرف شاعری کی ہے بلکہ نثر بھی تخلیق کی ہے۔ان کی نثر میں بھی ترقی پسند نظریات کا گہرا رچاؤ نظر آتا ہے۔انہوں نے نثر کو بھی بھر پور انداز میں لکھا ہے۔ان کی نثری تحریروں میں ادب اور سائنس کا امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی شاعری کی طرح ان کی نثری تحریروں میں بھی موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔

نثر میں ان کا نقطہ نظر ترقی پسندانہ ہے مگر یک رخا نہیں بلکہ کشادہ نظری کا غماز ہے۔ "ترقی پسند تحریک کا سفر" اور" ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال" ترقی پسند تحریک کو سمجھنے کے سلسلے میں اہم ماخذ ہیں۔ جمال نقوی نے ان کتابوں میں ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء

کی کہانی موثر انداز میں ایک کتاب کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے گو کہ ایسا کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے مگر انھوں نے کمال مہارت سے تحریک کے آغاز سے قبل اور اس کے بعد کی ادبی صورت حال کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے تحریک کے آغاز سے لے کر موجودہ دور تک کی نثر میں آنے والے اتار چڑھاؤ کی بات کی ہے۔ کسی بھی صنف ادب کا تخلیقی دور بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ شاعر یا ادیب معاشرے ہی کا ایک فرد ہوتا ہے اور اپنے ارد گرد کے ماحول سے اثرات قبول کرتا ہے۔ اس لیے ادب کا تخلیقی دور نہایت اہم ہوتا ہے اور تحریروں کے ذریعے ادیب اس منظر نامے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے اس مقالے میں اردو نثر کی ایک تاریخ ہے جو ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تخلیق ہوئی اور جس نے اردو ادب تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

رومانی تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک اردو ادب کے افق پر نمودار ہوئی۔ یہ تحریک رومانی تحریک کے ردِ عمل اور مارکسی نظریات سے متاثر ہو کر شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک پر مارکسی نظریات کا گہرا اثر تھا۔ اس تحریک نے پوری شدت کے ساتھ برصغیر میں پاؤں جمائے اور بہت سے اہلِ قلم اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ ابتدا میں اس تحریک کا رویہ بہت جارحانہ تھا۔ اس تحریک سے وابستہ اہلِ قلم نے شہرت حاصل کی اور اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر جمال نقوی کی کتاب "پاکستان میں ترقی پسند ادب کے معمار" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ افراد کے خاکے ہیں اور ان کی ادبی خدمات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ ان میں سے کچھ اہلِ قلم ایسے ہیں جنھوں نے ادبی دنیا میں شہرت کی بلندیوں کو چھوا ہے اور کچھ ہیں جو ادب کی خدمت پر معمور تو رہے مگر رہے ہمیشہ پس منظر میں ہی۔ اس تحریک نے نہ صرف بڑے شہروں بلکہ مضافاتی علاقوں میں بسنے والے افراد قلم کاروں کو بھی متاثر کیا اور وہ اس تحریک کے کارواں میں شامل ہو گئے۔ اس تحریک

کے آغاز سے آج تک اس کے کارواں میں شامل ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔
جن کا ادبی سرمایہ اردو ادب کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر جمال اردو ادب کے موجودہ منظرنامے میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں میں اہم مقام رکھتے ہیں اور اس تحریک کا بنیادی مقصد ان کی تحریروں میں واضح ہے۔

مصادر و مراجع

بنیادی مآخذ

جمال نقوی، ڈاکٹر، ننھے سورج دیس کے، کراچی: ادارہ تزئین دانش، ۲۰۰۰ء

مزاج سخن، کراچی: ارتقا بک کلب، ۲۰۰۳ء

جمال و کمال، کراچی: خیالی پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء

ترقی پسند تحریک کا سفر، کراچی، انجمن ترقی پسند مصنفین، پاکستان ۲۰۱۱ء

پاکستان میں ترقی پسند ادب کے معمار، کراچی: ادارہ تزئین دانش، ۲۰۱۲ء

ثانوی مآخذ

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی پسند اردو پاکستان، ۱۹۹۱ء

حسن محمد جعفری، ڈاکٹر، احمد سلیم، پاکستانی معاشرہ اور ادب، کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۳ء

سبط حسن، ماضی کے مزار، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۳ء

سبط حسن، نوید فکر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲ء

سجاد ظہیر، روشنائی، ملتان: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۶ء

سہیل احمد خاں، ڈاکٹر، منتخب ادبی اصطلاحات، شعبہ تصنیف و ترجمہ، جی سی یونیورسٹی لاہور: ۲۰۰۵ء

شمیم حنفی، جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۷ء

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، کراچی: اردو دنیا، ۱۹۶۱ء
قمر رئیس و عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب، دہلی: ۲۰۰۰ء
مجنوں گورکھپوری، سمن پوش اور دوسرے افسانے، دہلی: کتب خانہ علم و ادب، ۱۹۳۳ء
محمد زکریا، خواجہ، اردو نظم انتخاب ذریں، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۷ء
محمد عالم خاں، چند نئے ادبی مسائل، لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری، ۱۹۹۱ء

لغات

فرہنگ کارواں، فضل الٰہی عارف، لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۶۲ء
نور اللغات، (جلد سوم)، نور الحسن نیرّ، مولوی، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء

رسائل

ادبِ لطیف، ۵۵ سالہ نمبر، لاہور: ۱۹۹۰ء
افکار، کراچی: ۱۹۷۳ء
سہ ماہی خیال، جمال نقوی نمبر، کراچی: ۲۰۰۸ء
فروغ اردو، لکھنؤ: ۱۹۷۳ء
فنون خدیجہ مستور نمبر، لاہور: ۱۹۸۳ء
معیار فیض نمبر، دہلی: ۱۹۸۷ء
تحریریں، لاہور: ۱۹۷۳ء

اعزازات اور تصنیفات و تالیفات وغیرہ

اعزازات:

''نشانِ اعزاز'' (دوسرا انعام برائے 'ترقی پسند ادب کے معمار' ۲۰۱۴ء

''نشانِ سپاس' انجمن ترقی پسند مصنفین۔ پاکستان ۲۰۱۳ء

فیض ایوارڈ۔ ۲۰۱۲ء

پلاٹینم جوبلی ایوارڈ، انجمن ترقی پسند مصنفین، ۲۰۱۱ء

فیض ایوارڈ، علیگڑھ (بھارت) ۲۰۱۱ء

نشانِ اعزاز (تیسرا انعام برائے فیض کا فکری ابلاغ) ۲۰۱۱ء

نشانِ اعزاز (دوسرا انعام برائے مجنوں گورکھپوری شخصیت و فن) ۲۰۱۰ء

شیلڈ برائے مقالہ نگار، ۷ویں قومی سیمینار، آئی وی پی ۲۰۱۰ء

نشانِ اعزاز (خصوصی برائے 'بلاوا') ۲۰۰۹ء

مجنوں گورکھپوری ایوارڈ ۲۰۰۸ء

نشانِ اعزاز (خصوصی انعام برائے 'ترقی پسند تحریک ادب اور سجاد ظہیر') ۲۰۰۶ء

نشانِ اعزاز (پہلا انعام برائے 'نقد و شخص) ۲۰۰۵ء

سجاد ظہیر ایوارڈ۔ ۲۰۰۵ء

سرسید احمد ایوارڈ، ۲۰۰۳ء

بہترین مولف 'قائدین پاکستان' ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر جمال نقوی کی ادبی خدمات

بہترین ہائیکو نگار، نغمے سورج دیس کے ۲۰۰۰ء

بہترین مدیر، فیڈریشن آف انجینئرنگ انسٹی ٹیوشن آف اسلامک کنٹریز۔ ۱۹۹۹ء

فردوسی ایوارڈ (ایران) ۱۹۹۹ء

اکادمی ایوارڈ برائے 'ادب اور سائنس' ۱۹۹۸ء

آئی ای پی قائداعظم ایوارڈ۔ ۱۹۹۷ء

پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ۔ برائے سائنس و انجینئرنگ ۱۹۹۵ء

تخلیق ایوارڈ۔ برائے شاعری ۱۹۹۴ء

لوحِ اعزاز۔ برائے ادب ۱۹۹۱ء

میڈل۔ برائے حسن کارکردگی ۱۹۹۲ء

لوحِ اعزاز۔ برائے ادب ۱۹۹۱ء

تصنیفات و تالیفات:

نئے دن کی بشارت (شعری مجموعہ) ۲۰۱۴ء

روشن راہیں۔ (کالموں کا مجموعہ): ۲۰۱۳ء

ترقی پسند ادب کے معمار (تذکرہ نگاری) ۲۰۱۳ء

ابراہیم جلیس۔ انسان اور قلم کار ۲۰۱۳ء

دھنک رنگ (انتخاب کلام مع تراجم) ۲۰۱۲ء

ڈاکٹر محمد علی صدیقی شخصیت و فن (تالیف) ۲۰۱۲ء

ارمغان ممتاز (تالیف) ۲۰۱۲ء

ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال (تحقیق) ۲۰۱۲ء

فیض کا فکری ابلاغ (تنقید) ۲۰۱۱ء

ترقی پسند تحریک کا سفر (تاریخ) ۲۰۱۱ء

پنج رنگ (انتخاب کلام مع تراجم) ۲۰۱۰ء

ڈاکٹر جمال نقوی کی ادبی خدمات

مجنوں گورکھپوری۔ شخصیت وفن (تنقید) ۲۰۱۰ء

بلاوا (سفرنامہ) ۲۰۰۹ء

ہجرت (ترجمہ) ۲۰۰۸ء

زندگی کا سورج (شعری مجموعہ) ہندی۔ ۲۰۰۷ء

جمال وکمال (یادداشتیں) ۲۰۰۷ء

ترقی پسند تحریک۔ ادب اور سجاد ظہیر (تنقید) ۲۰۰۶ء

کہانیاں دیس دیس کی (تراجم) ۲۰۰۶ء

نقد و تخص (تنقید) ۲۰۰۵ء

ادب، سائنس اور جمہوریت (تنقید) ۲۰۰۴ء

مزاج سخن (مجموعہ غزلیات) (۲۰۰۳ء)

قائدین پاکستان (پاکستانیات) ۲۰۰۲ء

قلم برائے امن (نثری تالیف) ۲۰۰۱ء

قلم کا سفر (نثری تالیف) ۲۰۰۰ء

ننھے سورج دیس کے (مجموعہ ہائیکو) ۲۰۰۰ء

ادب اور سائنس (نثری تالیف) ۱۹۹۹ء

خوشبو گلاب کی (عالمی تراجم وطبع زاد نظمیں) ۱۹۹۸ء

آئی ایم ایف اور پاکستان کی سیاسی معیشت (ترجمہ) ۱۹۹۷ء

انجینئرنگ ہورائزن (انگریزی مضامین) ۱۹۹۵ء

مکان شیشے کا (شعری مجموعہ) ۱۹۸۷ء

گلہائے عقیدت (منقبتی مجموعہ) ۱۹۸۵ء

ہمہ جہت اقبال (تنقید) زیر طبع

معجزۂ فن (فارسی کلام اقبال مع ترجمہ وتشریح) زیر طبع

منتخبات مجنوں (انتخاب) زیر طبع

ہائیکو دبستان (زیر طبع)

سندھ کے ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات۔ (تالیف) زیرِ طبع
اکیسویں صدی (سائنسی مضامین) زیرِ طبع
ہم کلام (مکالمے) زیرِ طبع
ترقی پسند نظم (تحقیق) زیرِ طبع

قومی و بین الاقوامی سیمینار / کانفرنسوں میں شرکت:

پروفیسر ممتاز حسین یادگاری لیکچر (تعارف) ۲۰۱۵ء
کرشن چندر صدی کانفرنس، کراچی، ۲۰۱۴ء
عالمی اردو کانفرنس، ۲۰۱۴ء، کراچی بحیثیت مقالہ نگار
قومی ادبی کانفرنس (بیادِ علی سردار جعفری) ۲۰۱۳ء، کوئٹہ (بلوچستان) بحیثیت مقالہ نگار
علی سردار جعفری کانفرنس، ۲۰۱۳ء، کراچی بحیثیت مقالہ نگار و ناظم۔
پلاٹینم جوبلی کانفرنس، انجمن ترقی پسند مصنفین۔ ۲۰۱۲ء کراچی بحیثیت آرگنائزر و ناظم
جشنِ فیض ۲۰۱۱ء، منعقدہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، بحیثیت مقالہ نگار
عالمی اردو کانفرنس، ۲۰۱۰ء، منعقدہ لاہور، کراچی، بحیثیت مقالہ نگار
عالمی کانفرنس، ۲۰۰۷ء، منعقدہ دہلی، الہ آباد، لکھنو بحیثیت مقالہ نگار
جشن سجاد ظہیر ۲۰۰۵ء، منعقدہ جامعہ ملیہ دہلی و الہ آباد بحیثیت مقالہ نگار
فیک کانفرنس منعقدہ قازقستان۔ ۱۹۹۹ء، بحیثیت مقالہ نگار
فیڈریشن آف انجینئرنگ انسٹی ٹیوشنز آف اسلامک کنٹریز (فیک) کی کانفرنس، منعقدہ تہران، (ایران) ۱۹۹۸ء، میں

بحیثیت مقالہ نگار

کل پاکستان اہل قلم کانفرنس، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، بحیثیت مقالہ نگار

شعبۂ اردو

جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

تصدیق نامہ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ صائمہ یعقوب نے مقالہ بعنوان ''ڈاکٹر جمال نقوی کی ادبی خدمات (ترقی پسند تحریک کے تناظر میں)'' برائے حصول سند ایم۔اے، اردو میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ محنت سے لکھا گیا ہے۔ اور میری معلومات کے مطابق سرقہ سے کام نہیں لیا گیا۔ میں اس کے نتائج اور انداز تحریر و تحقیق سے مطمئن ہوں۔ میرے خیال میں یہ مقالہ برائے جانچ اور زبانی امتحان، جناب ناظم امتحانات جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کو بھیجا جا سکتا ہے۔ تاکہ وہ اس پر مزید ضروری کارروائی کر سکیں۔

نام اور دستخط نگران مقالہ مع تاریخ

ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

صدر شعبہ

[illegible]

ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ

Dean
Faculty of Islamic &
Oriental Learning
GC University Faisalabad